سُرخ تیر کا شکار

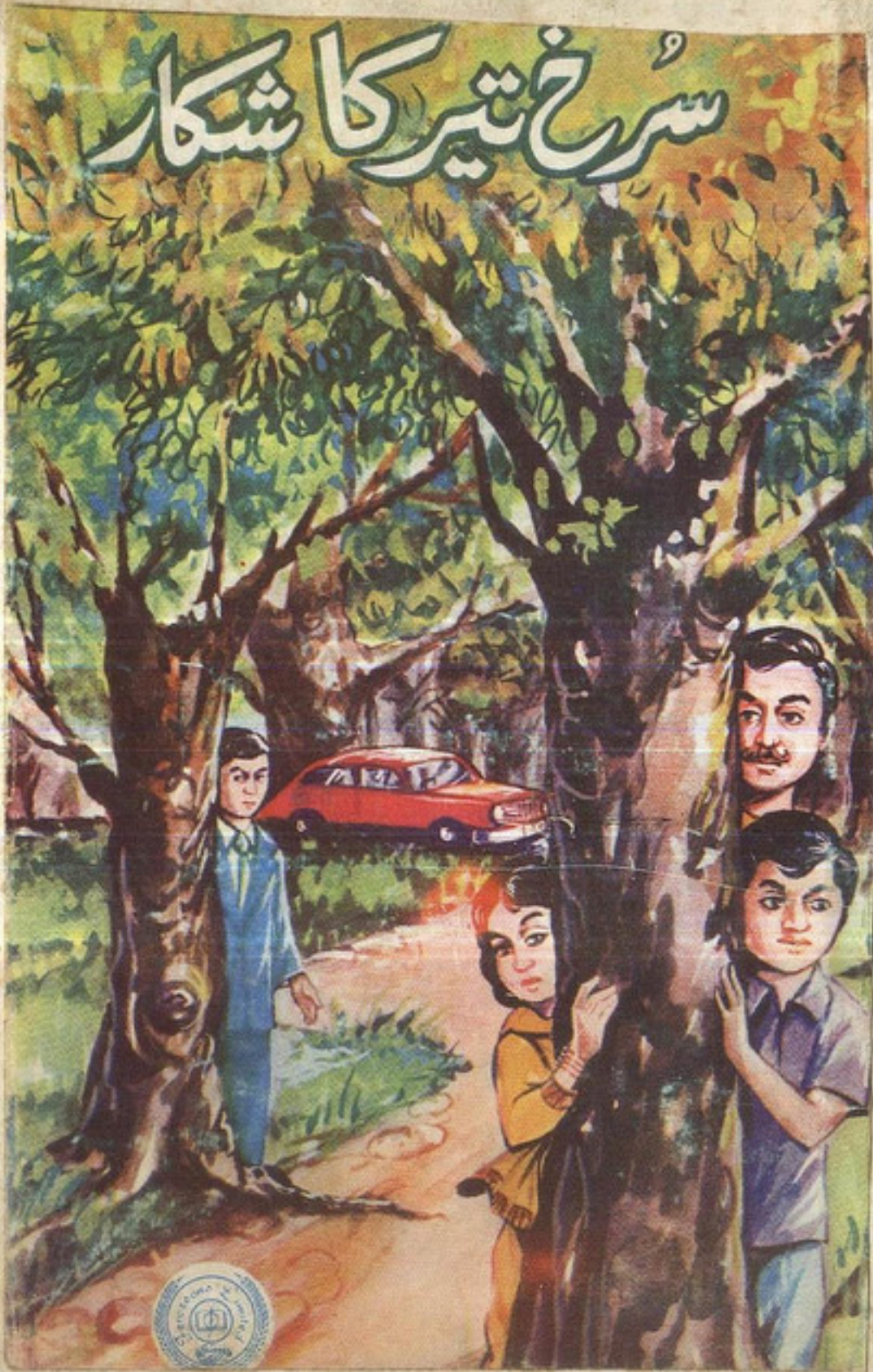

سُرخ تیر: پہلا حصّہ

یشوما اور سُرخ تیر

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: تیسرا حصّہ

سُرخ تیر کے قیدی

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: چوتھا حصّہ

سُرخ تیر کی وادی میں

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: دوسرا حصّہ

سُرخ تیر کا شکار

بچّوں کے لیے ناول

یہ کون؟

وہ سڑک کے بیچوں بیچ آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ اس کے شانے جھکے ہوئے تھے اور وہ بے حد تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جوں جوں وہ اُن سے نزدیک ہو رہا تھا، اُن کے ہوش اُڑتے جا رہے تھے کیوں کہ اب انھیں اس کے دائیں ہاتھ میں کوئی پستول نما چیز بھی دکھائی دینے لگی تھی، اگرچہ ابھی تک اندھیرے کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آیا تھا۔ پستول کی نال کا رُخ سڑک کی طرف تھا۔

اچانک وہ لڑکھڑایا اور سڑک پر اوندھے مُنھ گر گیا۔ وہ چونک اُٹھے۔

"کہیں یہ اس کی چال نہ ہو۔ ہو سکتا ہے اس نے ہمیں درختوں کے پیچھے چھُپتے دیکھ لیا ہو اور سڑک پر خود کو اس طرح گرا کر یہ چاہتا ہو کہ ہم درختوں کی اوٹ سے نکل کر اس کے نشانے کی زد میں آ جائیں۔

سیکرٹری صاحب نے خیال ظاہر کیا؛

"بات تو یہی لگتی ہے۔ ہمیں کچھ دیر تک اسی طرح چھپے رہنا چاہیے۔" مُنوّر علی خاں نے کہا۔

"لیکن ابّو، وہ کوئی حرکت نہیں کر رہا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ بے ہوش ہو کر گرا ہے۔" فرحت نے کہا۔

"کیوں نہ ہم اسی طرح درختوں کی اوٹ لے کر اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کریں۔" آفتاب نے مشورہ دیا۔

"یہ بہت اچھا خیال ہے۔ اس طرح وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" آصف جلدی سے بولا۔

"اگر تم یہی چاہتے ہو تو پھر چلو۔" مُنوّر علی خاں نے شانے اُچکائے۔

اور وہ درختوں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے لگے۔ وہ ایک درخت سے دُوسرے درخت کی طرف چھلانگیں لگاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک فرحت کا پاؤں کسی نرم چیز پر پڑا۔ اس کے پیروں کے نیچے آنے والی چیز کے مُنھ سے ایک درد ناک چیخ نکلی۔ ساتھ ہی فرحت بھی زور سے چیخی۔ اُنھوں نے ایک چھوٹے سے جانور کو چھلانگیں مار کر جنگل کی طرف بھاگتے دیکھا۔

"جنگلی چُوہا تھا۔" آفتاب ہنسا۔

"مجھے اب پتا چلا کہ فرحت کتنی بہادر ہے۔" آفتاب نے مُسکراتے ہوئے کہا "انکل تو شیروں، چیتوں اور ہاتھیوں کا شکار کرتے ہیں، اور فرحت کا یہ عالم ہے کہ ایک جنگلی چُوہے سے ڈر گئی۔"

"آہستہ بولو۔ تم لوگ ہر وقت ٹوک جھونک کرتے رہتے ہو۔ نہ موقع دیکھتے ہو نہ محل۔" مُنوّر علی خاں نے دبی آواز میں کہا۔

"انکل، ہم اسی لیے بے فکر ہو کر باتیں کر رہے ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ سڑک پر لیٹا ہوا شخص بے ہوش ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کوئی چال نہیں چل رہا۔" آفتاب بولا۔

"تم ابھی بچّے ہو۔ دُشمن کیا کیا چالیں چلتے ہیں، سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"تم نے دیکھا، ان لوگوں نے لیشوما کو کیسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ بے چارہ اپنے وطن جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مرنے کے بعد بھی حسرت ٹپک رہی تھی۔" آصف نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ اسے لیشوما کا وطن اور گھر بار یاد آ گیا تھا

"یہ ٹھیک ہے کہ اِس قسم کے حالات سے ہمارا آج تک

سابقہ نہیں پڑا۔ پھر بھی میں جانتا ہوں کہ ہم ان حالات کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ میرے اس خیال کی تائید یشوما کے ان الفاظ سے بھی ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا تھا، اس ملک کے صرف دو آدمی اور اُن کے بچے اس مُہم پر روانہ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"بس بس۔ اپنے مُنھ میاں مٹھو نہ بنو۔" فرحت نے کہا۔

"بہت اچھا، نہیں بنتا۔ تم بن لو۔" آفتاب مُسکرایا۔

"لیجیے۔ پھر شروع ہو گئے یہ حضرت۔" آصف نے جھلّا کر کہا۔

"آخر تم لوگ میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

"اور یہاں کون ہے جس کے پیچھے پڑیں؟" فرحت نے کہا۔

"اچھا خاموش، ورنہ میں سچ مچ تم تینوں کے ہونٹوں کو تالا لگا دوں گا۔ ہم اس کے قریب پہنچ گئے ہیں۔" مُنوّر علی خاں نے اُنھیں ڈانٹا۔

اب وہ اس شخص کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ اوندھے مُنھ پڑا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ اسے صاف طور پر نہ دیکھ سکے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں آفتاب کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ بے چین ہو گیا اور

تیزی سے آگے بڑھا۔ مُنوّر علی خاں اسے روکتے ہی رہ گئے مگر وہ درخت کی اوٹ سے نکل کر سڑک پر جا پہنچا تھا۔ دُوسرے ہی لمحے ان سب نے اس کی گھٹی گھٹی سی چیخ سُنی۔

وہ گھبرا گئے اور اس کی طرف دوڑ پڑے۔ نزدیک پہنچ کر اُنھوں نے دیکھا، بے ہوش شخص کامران مرزا کے سوا کوئی نہ تھا۔

اُنھوں نے بوکھلاہٹ میں انھیں سیدھا کیا۔ وہ بالکل بے ہوش تھے۔ سیکرٹری صاحب جلدی سے گئے اور کار کو اس جگہ لے آئے۔ کار کی لائٹوں کی روشنی میں اُنھوں نے دیکھا کہ کامران مرزا کی ران سے خُون رِس رہا ہے۔ ان کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ شاید خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ اُنھوں نے جلدی سے اُنھیں کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ اُن کی موٹر سائیکل مُنوّر علی خان نے سنبھالی اور سب ہسپتال کی طرف چل پڑے۔

سیکرٹری صاحب کی ہسپتال میں آمد سے ہل چل سی مچ گئی۔ کامران مرزا کو فوراً پرائیویٹ وارڈ کے ایک کمرے میں پہنچایا گیا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں نے ٹانگ کا مُعاینہ کرنے کے بعد بتایا کہ ان کے گولی لگی ہے اور گولی ابھی

ٹانگ میں موجود ہے۔ آپریشن کرنا ہوگا۔

فوراً آپریشن کا انتظام کیا گیا۔ آپریشن کے دوران میں بھی کامران مرزا بے ہوش ہی رہے۔ خون دینے کی ضرورت پیش آئی تو سب نے اپنے بازو آگے کر دیے لیکن ڈاکٹر نے منوّر علی خاں کا خون تجویز کیا اور انھیں خون دیا جانے لگا۔

رات کا بقیّہ حصّہ انھیں ہسپتال میں ہی گزارنا پڑا۔ بچّوں کو ایک علیٰحدہ کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ اب ان کی بشوخی رخصت ہو گئی تھی۔ آفتاب تو گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ آصف نے اُس کا دھیان بٹانے کے لیے کہا:

"جو کبھی خاموش اور سنجلا نہیں بیٹھتا تھا، وہ اس وقت خاموش بیٹھا ہے۔ حیرت کا مقام ہے۔"

"اس میں اس کا قصور کیا ہے۔ حادثہ ہی اتنا تکلیف دہ ہے۔" فرحت سنجیدہ تھی۔

"پھر بھی، مجھے اس کی زندہ دِلی سے ایسی اُمّید نہ تھی۔" آصف نے کہا۔

"میں اب بھی وہی آفتاب ہوں۔ ایک بار ابّا جان کو ہوش آ لینے دو۔ پھر دیکھنا، کیسے چہکتا ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر انھیں صُبح ہونے تک ہوش آ گیا تو ان کے بچنے کی اُمّید کی جا سکتی ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ انشاءاللہ انھیں صُبح سے پہلے ہوش آ جائے گا۔"

"خُدا تمھاری زبان مُبارک کرے۔" آفتاب کے مُنھ سے نکلا اور وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

"ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ انکل کو جنگل میں کیا واقعات پیش آئے، فائرنگ کون کر رہا تھا اور انھیں گولی کس نے ماری؟" آصف نے کہا۔

"ان تمام سوالات کے جوابات صرف انکل ہی دے سکتے ہیں۔" فرحت نے کہا "ویسے یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ انکل اس شخص کے تعاقب میں گئے تھے جس نے یشوما کے تیر مارا تھا۔ ضرور اُنھوں نے اسے جنگل میں جا لیا ہو گا۔ دونوں طرف سے گولیاں چلی ہوں گی اور ایک گولی انکل کی ران میں لگ گئی ہو گی۔"

"سوال یہ ہے کہ اس شخص کا کیا بنا؟ کیا وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا؟"

"خُدا جانے۔ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔" فرحت نے کہا۔

"یہ رات بھی کس قدر عجیب ہے! اسے ہنگاموں کی رات کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔" آفتاب کے مُنھ سے نکلا۔

"یشوما کا ہمارے گھر میں کیا آنا تھا کہ اُوپر تلے ہنگامے

شروع ہو گئے ۔ اس وقت سے سکون کا سانس نہیں لیا۔
سب لوگوں کو گرفتار کرنے کے بعد جب ہم نے یشوما سے بات چیت شروع کی، تو ہم سمجھتے تھے کہ اس رات میں جتنے ہنگامے ہونے تھے، ہو چکے ۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔"

"اور ابھی رات کے تین گھنٹے باقی ہیں ۔ اُف! یہ تین گھنٹے کتنے لمبے معلوم ہو رہے ہیں جیسے ہمیں ہسپتال کے اس کمرے میں تین سال گزارنے کا حکم دیا گیا ہو۔"

"انسان بھی کتنا بے بس ہے۔ اس کے اختیار میں کچھ بھی تو نہیں ۔ یوں ہم نہ جانے کیا کیا سوچتے رہتے تھے۔ پروگرام بناتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اگلے چند لمحوں تک زندہ بھی رہیں گے یا نہیں ۔ یشوما کو ہی لے لو۔ کتنے اطمینان سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا، اور پھر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے سانس لینے کے لیے رُکا ہو۔ کم از کم میں تو یہی سمجھا تھا۔" آفتاب نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"خُدا کو یہی منظور تھا۔ ویسے میں سمجھتا ہوں اس کے مر جانے سے اس مُہم کے راستے بند نہیں ہوئے۔ ہمیں اب مُشکلات تو ضرور پیش آئیں گی لیکن میرا خیال ہے، انکل صحت یاب ہوتے ہی مُہم پر روانہ ہونے کے لیے تیار ہو

جائیں گے۔" آصف نے کہا۔

"لیکن اب ہمیں کچھ بھی تو نہیں معلوم ۔ ہمیں کہاں جانا ہے؟ وہ کون سی وادی ہے جس میں موت کی حکم رانی ہے؟ اسے کون سا راستہ جاتا ہے؟"

"وہ ضرور کوئی نہ کوئی راستہ معلوم کر لیں گے۔" فرحت نے کہا۔

"ارے! ہم بھول رہے ہیں" اچانک آفتاب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"کیا مطلب؟ ہم کیا بھول رہے ہیں؟" آصف بُری طرح چونکا۔ فرحت بھی حیران نظروں سے آفتاب کو گھورنے لگی۔

"اُف، میرے خُدا! کیا آج کی رات ہم سب کے دماغ بے کار ہو گئے ہیں؟" آفتاب نے پُر اسرار لہجے میں کہا۔

"آخر بات کیا ہے؟ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟" آصف نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہم ان تین شیشیوں اور تین ڈبیوں کو تو بھول ہی گئے ۔ وہ شیشیاں جن میں زرد رنگ کا کوئی تیل تھا۔ اور وہ سُنہری اور نیلی ڈبیاں۔"

"اوہ! واقعی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، انکل نے وہ تپائی پر رکھ دی تھیں۔"

"ہاں۔ اور وہ وہیں پڑی رہ گئی تھیں۔" فرحت کے مُنھ سے نکلا۔

"آخر ان میں ہے کیا؟" آفتاب نے سوال کیا۔

"خُدا جانے ان میں کیا ہے، اور وہ اب وہاں موجود بھی ہیں یا نہیں۔"

"یشوما نے پستول بھی تو اسی تپائی پر سے اُٹھا کر ہم پر تانا تھا۔"

"ہاں۔ لیکن اس نے ان چیزوں کو اُٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا چیزیں ہیں اور اگر معلوم تھا تو وہ اس کے لیے بے فائدہ تھیں۔"

"اوہ!.... اُف!.... ارے!" آفتاب کے مُنھ سے حیرت کی وجہ سے یہ الفاظ نکلے۔

"یہ کوئی جُملہ ہے یا حروفِ علّت یاد کر رہے ہو؟" آصف نے گھبرا کر پوچھا۔

"آج رات واقعات کچھ اس طرح پے در پے پیش آئے ہیں کہ عقل چکرا کر رہ گئی ہے۔ ہم نے یشوما کی

تلاشی نہ اس کی زندگی میں لی اور نہ مرنے کے بعد، حال آں کہ یہ بہت ضروری تھا۔ شاید اس کی جیبوں سے بھی ویسی ہی کوئی شیشی اور ڈبیا نکلتی۔ ہو سکتا ہے کوئی اور کارآمد چیز مل جاتی۔" آفتاب نے بتایا۔

"بات تو واقعی سوچنے کی ہے، مگر اب بھی کیا بگڑا ہے۔ یشوما کی لاش تو اس وقت بھی گھر میں موجود ہے۔ ہم یہاں سے فارغ ہو کر اس کی جیبوں کی تلاشی لے سکتے ہیں۔" فرحت نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن لاش کب سے گھر میں بغیر نگرانی کے پڑی ہے۔ اس دوران میں مجرموں کا کوئی ساتھی آ کر آسانی سے اس کی تلاشی لے سکتا ہے۔" آصف نے کہا۔

"اس صورت میں شیشیاں اور ڈبیاں بھی جہاں تپائی پر نہیں ملیں گی۔"

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر، دیکھا جائے گا۔ ہم اس سے پہلے کچھ نہیں کر سکتے، جب تک انکل کو ہوش نہیں آجاتا۔" آصف نے کہا۔

اسی وقت مُنوّر علی خاں اندر داخل ہوئے۔ وہ مُسکرا رہے تھے۔ تینوں اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"بیٹے، تمھارے ابّو کو ہوش آگیا ہے اور وہ تمھیں

بُلا رہے ہیں۔"

وہ دوڑتے ہوئے کامران مرزا کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں سیکرٹری صاحب بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحبان جا چکے تھے، البتہ ایک نرس ابھی تک موجود تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ کیا تم یشوما کی تلاشی لے چکے ہو؟" کامران مرزا نے پوچھا۔ تینوں کے مُنھ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلا سوال یہی کریں گے۔

"انکل، ہم تو آپ کے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔" آصف نے کہا۔

"اوہ! تو اس کی تلاشی نہیں لی گئی؟ اور وہ تینوں شیشیاں اور ڈبیاں؟ وہ بھی وہیں رہ گئی ہوں گی۔" کامران مرزا نے گھبرا کر کہا۔

"جی ہاں۔" آصف نے ندامت سے کہا۔

"یہ بہت بُرا ہوا۔ بہت بُرا۔ تم لوگوں میں سے چند ایک کو گھر ہی میں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ خیر، دیکھا جائے گا۔ تم لوگ مجھے کہاں سے اُٹھا کر لائے ہو؟"

"شمالی سڑک سے۔" مُنوّر علی خان نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ جس جگہ میری موٹر سائیکل ملی ہو گی اس سے تقریباً ایک میل آگے ایک لاش پڑی ہے۔ پولیس پارٹی کے ساتھ جا کر اسے قبضے میں لے لو اور اس کی تلاشی ضرور لینا۔ اس کے بعد تم لوگ گھر جاؤ گے۔ اگر یشوما کی لاش موجود ہو تو اس کی تلاشی لو اور شیشیاں اور ڈبیاں بھی قبضے میں کر لو۔" کامران مرزا نے انھیں ہدایات دیں پھر سیکرٹری صاحب کی طرف مُڑے:

"آپ آئی جی صاحب سے کہہ کر ان کے ساتھ پولیس پارٹی بھیجنے کا انتظام کر دیں اور ساتھ ہی کچھ کانسٹیبل میرے گھر کی نگرانی کے لیے بھیج دیں۔ لیکن وہ اندر نہ گھسیں، صرف باہر رہ کر ہی نگرانی کریں۔"

"میں ابھی اس کا انتظام کیے دیتا ہوں۔" سیکرٹری صاحب بولے۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ ایک بار پھر اسی سڑک پر چلے جا رہے تھے جس پر سے کچھ دیر پہلے کامران مرزا کو زخمی حالت میں اُٹھا کر لائے تھے۔ اس مرتبہ پولیس پارٹی ان کے ساتھ تھی اور وہ پولیس کی جیپ میں بیٹھے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے، آج کی رات شاید وہ ایک منٹ بھی آرام نہیں کر سکیں گے۔ یہ رات ان کی

زندگی کی سب سے انوکھی رات تھی۔

شمالی سڑک سرحد تک چلی گئی تھی اور یہ علاقہ بالکل غیر آباد تھا۔ راستے میں انھیں دُوسری طرف سے آتی کوئی گاڑی نظر نہ آئی۔ پھر وہ اس مقام پر پہنچے جہاں انھیں موٹر سائیکل نظر آئی تھی۔ رات کے وقت اس جگہ کو یاد رکھنا مشکل تھا لیکن آفتاب اور آصف کامران مرزا کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ایسے معاملات میں بہت ہوشیار ہو گئے تھے۔ واپسی پر اُنھوں نے کلائی کی گھڑیوں پر برابر نظر جمائے رکھی تھی۔ انھیں یاد تھا کہ وہ اس جگہ سے ہسپتال سترہ منٹ میں پہنچے تھے۔ اس وقت بھی وہ گھڑیوں پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ جُوں ہی سترہ منٹ پورے ہوئے، آفتاب بول اُٹھا:

"ابّا جان، اس جگہ کے آس پاس ہی کہیں پڑے ملے تھے۔ لہٰذا اس جگہ سے ایک میل آگے جانا ہے۔ تقریباً تین فرلانگ چل کر گاڑی آہستہ کرلیں۔ کیوں کہ لاش سڑک سے نیچے، نشیب میں پڑی ہے اور وہ ہمیں جیپ میں سے نظر نہیں آئے گی۔"

سب انسپکٹر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور پون میل کے فاصلے پر جیپ روک دی۔ وہ سب اُتر پڑے۔

سب انسپکٹر کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ سڑک کے بائیں طرف نشیب میں لائٹ ڈالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ باقی سب لوگ اس کے پیچھے تھے۔ اچانک ٹارچ کی روشنی ایک جگہ جم کر رہ گئی۔

وہاں کوئی شخص اوندھے مُنھ پڑا تھا۔ سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر اُسے سیدھا کیا۔ دُوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

وہ نمبر نو کی لاش تھی۔

بُری خبر

"ارے! یہ تو نمبر نو کی لاش ہے۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا مطلب؟ نمبر نو کیا؟" سب انسپکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی اس کا نام ہے۔" آصف نے بتایا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"انسپکٹر صاحب، ہم کیا کیا سمجھائیں۔ آج کی رات تو بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔" آفتاب نے بے بسی سے کہا "البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ نمبر نو ہے۔ نمبر دس، گیارہ، بارہ، تیرہ اور چودہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن نہ جانے ان کا کیا بنا۔ یہ لوگ تو گرفتار کر لیے گئے تھے۔"

"گرفتار کر لیے گئے تھے؟ کس نے گرفتار کیا تھا انھیں؟"

"ہم نے۔ سب انسپکٹر خالد انھیں ہمارے گھر سے حوالات میں لے گئے تھے۔"

"تب پھر انسپکٹر خالد اُن کو لے کر تھانے نہیں پہنچے۔"

"کیا کہا؟ نہیں پہنچے؟" وہ چلّائے۔

"ہاں۔ میں اتفاق سے اس وقت تھانے میں موجود تھا۔ جب ڈی۔ ایس۔ پی صاحب کا فون آیا تھا۔ لیکن چوں کہ خالد صاحب ابھی تھانے نہیں پہنچے تھے اس لیے مجھے روانہ ہونا پڑا۔"

"تو پھر سب انسپکٹر خالد کہاں گئے؟ اُن پر کیا بیتی؟" آصف نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ تو انسپکٹر خالد ہی بتا سکیں گے۔"

"تو پھر نمبر نو کی تلاشی لیں اور جو کچھ برآمد ہو، ہمارے حوالے کر دیں۔"

"ہاں، مجھے یہی ہدایات ملی ہیں۔" سب انسپکٹر نے کہا اور جُھک کر نمبر نو کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیبوں سے کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ سب انسپکٹر نے ٹارچ کی روشنی اِدھر گرد ڈالی۔ آخر ایک درخت کے نیچے انھیں کوئی سیاہ سی چیز نظر آئی۔ وہ لپک کر اس کے پاس گئے۔ یہ ایک پستول تھا۔ سب انسپکٹر نے اُسے نال سے پکڑ کر اُٹھایا اور ناک

کے قریب لے جا کر سونگھا۔ اس میں سے بارود کی بو آ رہی تھی۔

"اس سے گولیاں چلائی گئی ہیں۔ یہ ہے بھی پولیس ریوالور اور اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ریوالور سب انسپکٹر خالد کے سوا کسی کا نہیں۔"

"اگر یہ اُن کا ہے تو پھر وہ خیریت سے نہیں ہوں گے۔ اب ہمیں اُن کی فکر کرنی چاہیے۔" آصف نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں۔ آج کی رات ہمیں سانس نہیں لینے دے گی۔ یار آصف، ذرا دیکھنا، کیا وقت ہوا ہے؟" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"کیوں؟ وقت کا خیال کیوں آ گیا؟" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ صبح ہونے میں کتنی دیر باقی ہے؟"

"اس وقت سوا تین بج رہے ہیں، اور دن نکلنے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ہمیں کچھ اور ہنگاموں کا سامنا کرنا ہو گا۔"

"خدا کے لیے اپنی زبان کو یہیں روک لو۔ اگر یہ چل پڑی تو کسی طرح رکنے کا نام نہیں لے گی، اور ابھی ہمیں گھر بھی پہنچنا ہے۔" فرحت نے گھبرا کر کہا۔

"لو بابا، میں اب نہیں بولوں گا۔" آفتاب نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

سب انسپکٹر نے ریوالور رومال میں لپیٹ کر آفتاب کے حوالے کر دیا۔

"میرا خیال ہے، اب اس کی ضرورت نہیں۔ اسے معائنے کے لیے لیبارٹری بھجوا دینا چاہیے۔ در اصل ابّا جان کا مطلب تو کسی ایسی چیز سے ہو گا جو لاش کی اپنی ہو۔ یہ تو ہمارے ہی ایک آدمی کا ہے اور اس سے ضرور اس نے چھینا ہو گا۔" آفتاب نے یہ کہہ کر دوسروں کی طرف دیکھا سب نے اس کے خیال کی تائید میں سر ہلائے اور اس نے ریوالور سب انسپکٹر کو لوٹا دیا۔

لاش کو جیپ میں رکھ دیا گیا۔ وہ لوگ بھی بیٹھ گئے اور جیپ روانہ ہوئی۔

"ہمیں گھر کے پاس اتار دیں۔ اب ہم میں اور ہنگاموں کا سامنا کرنے کی تاب نہیں۔ اب ہم سوئیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم اگلے اقدام کے بارے میں کامران مرزا

صاحب سے فون کر کے معلوم کر لیں گے۔ یوں بھی اس وقت سب سے زیادہ ضروری کام سب انسپکٹر کی تلاش کا ہے۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا گزری۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" آصف نے کہا۔

"اور مجھے ہسپتال اُتار دیجیے گا۔ میرا وہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ تم تینوں کو اکیلے ڈر تو نہیں لگے گا؟" منور علی نے پہلا جملہ سب انسپکٹر سے اور دوسرا ان تینوں سے کہا۔

"ڈر؟ یہ کس چڑیا کا نام ہے؟" آصف نے حیران ہو کر کہا۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔ اس نے کہا "سب انسپکٹر صاحب، اس لاش سے ہوشیار رہیے گا۔"

"کیوں، کیا کاٹ کھائے گی؟" سب انسپکٹر نے کہا۔

"مرا ہونے کے باوجود بھی زندہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے قابل ہے۔ کہیے تو تجربہ کر کے دکھا دیں۔" آفتاب نے کہا۔

"کیوں مذاق کرتے ہیں، جی۔"

"یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں اس وقت بھی موت کا سامان، یعنی زہریلا چھلا موجود ہے۔ اس چھلے سے ہوشیار رہیے گا۔ اگر اس کی

نوک کسی کے جسم سے چھو گئی تو وہ ایسی خوف ناک موت مرے گا جس کی تفصیل خود ہمیں بھی معلوم نہیں۔"

"کیا واقعی؟" سب انسپکٹر نے کہا۔ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"بس بس۔ ہمیں اس کھجے کے پاس سڑک کے کنارے ہی اُتار دیں۔ گلی ہم پیدل ہی طے کر لیں گے۔" آفتاب نے کہا۔ اگر وہ چند سیکنڈ اور خاموش رہتا تو جیپ ان کی گلی سے آگے نکل گئی تھی۔

سب انسپکٹر نے زور دار بریک لگائے۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور وہ تینوں چھلانگیں مارتے ہوئے نیچے اُتر آئے۔

وہ گھر کے دروازے پر پہنچے تو وہاں چھ کانسٹیبل موجود تھے۔ اب انھیں یاد آیا کہ یہ انتظام کامران مرزا کی ہدایت پر کیا گیا تھا۔ کانسٹیبل انھیں سیدھے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ چونک اُٹھے اور ایک سپاہی کرخت آواز میں بولا:

"خبردار! آگے نہ بڑھنا۔"

"ہائیں! یہ کیا بات ہوئی؟" آفتاب نے پلکیں جھپکائیں۔ "کیا تم جانتے ہو یہ کس کا مکان ہے؟" آصف نے پوچھا۔

"یہ انسپکٹر کامران مرزا صاحب کا مکان ہے۔"

"تو بس، ثابت ہوا کہ یہ مکان ہمارا ہے۔" آفتاب بولا "کیوں کہ ہم ان کے بچے ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ ان کا تو صرف ایک لڑکا ہے۔"

"اور اس لڑکے کا ایک دوست بھی ہے جو انھی کے ساتھ رہتا ہے اور ان دنوں ان کے ہاں ان کے دوست اور دوست کی بیٹی بھی آئے ہوئے ہیں لہٰذا دیکھ لو، ہم دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں۔" آفتاب مسکرایا۔

"ہم تصدیق کیے بغیر آپ کو اندر نہیں جانے دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم تصدیق کر لو۔"

"یہاں سے قریب ہی ایک پبلک ٹیلے فون بوتھ ہے۔ آؤ، وہاں سے فون کر لیں۔" کانسٹیبل نے کہا۔

"فون تو اندر بھی موجود ہے مگر اس کے تار کٹے ہوئے ہیں۔ چلو فون کر لیتے ہیں۔ آصف، فرحت، تم دونوں یہیں ٹھہرو۔"

"عجیب زمانہ آگیا ہے! ہمیں ہمارے ہی گھر میں داخل ہونے سے روکا جا رہا ہے!" آصف نے جھنجلا کر کہا اور آفتاب کانسٹیبل کو ساتھ لیے فون بوتھ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہسپتال کا نمبر ملایا گیا اور ہسپتال کے عملے نے سلسلہ کامران مرزا سے ملا دیا۔ آفتاب نے کہا:

"ابّا جان، ہم پر ہمارے ہی گھر کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ کامران مرزا چونکے۔

"اور یہ سب آپ کی ہدایت پر ہو رہا ہے۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟" انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"گھر کے دروازے پر چھ عدد کانسٹیبل موجود ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ کسی کو اندر نہیں جانے دیں گے۔ میں نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا تو وہ یقین کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ اس لیے اب میں فون کر رہا ہوں۔ چھ میں سے ایک یہاں تشریف لے آئے ہیں۔"

"اچھا، اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ تم یہ بتاؤ، جنگل سے وہ لاش ملی یا نہیں؟"

"جی۔ مل گئی۔ آپ جانتے ہیں، وہ کس کی ہے؟"

"نہیں۔ میں اندھیرے میں اس سے لڑتا رہا ہوں۔" کامران مرزا بولے۔

"وہ نمبر نو کی لاش ہے۔" آفتاب نے بتایا۔

"کیا!" کامران مرزا کے منہ سے چیخ سی نکلی۔ پھر وہ

بولے "اُف خُدایا! سب انسپکٹر خالد کہاں ہے ؟ کیا تم جانتے ہو؟"

"وہ قیدیوں کو لے کر تھانے نہیں پہنچ سکے۔ ان کے متعلق ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ویسے پولیس اب تک تلاش شروع کر چکی ہو گی۔"

"یہ بہت بُری خبر ہے۔ حالات لمحہ بہ لمحہ نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ خیر، تم ریسیور کانسٹیبل کو دو۔"

"یہ لیجیے۔ بات کر لیں۔" آفتاب نے ریسیور کانسٹیبل کو تھماتے ہوئے کہا۔

فون پر بات کرتے وقت کانسٹیبل گھبرا سا گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کامران مرزا کہیں اسے جھاڑ نہ پلائیں۔ لیکن دُوسری طرف کے الفاظ سُن کر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کامران مرزا اس سے کہہ رہے تھے:

"آپ بہت فرض شناس ہیں۔ میرے بچّوں کو اندر جانے دیں اور ان کو اپنے نام لکھوا دیں۔"

"جی .... جی .... بہت اچھا۔" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

دُوسری طرف سے سلسلہ بند ہونے کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا اور کہنے لگا:

"معاف کیجیے گا۔ ہم سے غلطی ہوئی۔"

"نہیں۔ یہ تو آپ کا فرض تھا۔ اچھا، چلیے۔"

وہ گھر میں داخل ہوئے تو انھیں یاد آیا کہ جس وقت وہ یشوما کی داستان سُننے کے لیے ڈرائنگ رُوم میں جمع تھے، فضلو سرونٹ کوارٹر میں سو رہا تھا۔ سب سے پہلے وہ فضلو کے کمرے میں گئے۔ وہ بدستور خرّاٹے لے رہا تھا۔ اُسے اُسی حالت میں چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، لیکن دروازے میں ہی رُک کر کھڑے ہو گئے۔

یشوما ابھی تک اسی طرح کُرسی کی پُشت سے ٹکا بیٹھا تھا۔ اس کے سینے میں تیر گڑا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ان کی نظریں تپائی پر پڑیں۔ یہ دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی کہ تینوں شیشیاں اور ڈبیاں جُوں کی تُوں پڑی تھیں۔ انھیں کسی کو بھی چھیڑنے یا اُٹھانے کا خیال نہیں آیا تھا۔

"اب ہمیں سب سے پہلے ٹیلے فون کے تار جوڑنے ہیں تاکہ ضرورت پڑنے پر اسے استعمال کر سکیں۔" آصف نے کہا۔

"بالکل ٹھیک، اور یہ کام تم دونوں کر ہی سکتے ہو۔" فرحت نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں، ہم تم جیسے کام چور نہیں۔" آفتاب نے کہا۔

"تار جوڑنے کے بعد ہم دیکھیں گے کہ ان شیشیوں اور

ڈبیوں میں کیا ہے؟"

"کہیں انکل ہمارے اس کام کو ناپسند نہ کریں۔" فرحت نے اعتراض کیا۔

"ہم ان شیشیوں اور ڈبیوں کا صرف جائزہ لیں گے انھیں توڑیں پھوڑیں گے نہیں۔" آفتاب بولا۔

"ٹھیک ہے۔ آؤ، اب تار جوڑیں۔ ویسے بھی اس کمرے میں یشوما پر بار بار نظر پڑتی ہے اور دل اُداس ہو جاتا ہے۔"

وہ فون والے کمرے میں آئے۔ تار جوڑنے میں انھیں صرف چند منٹ لگے۔ اس کے بعد آفتاب بولا:

"جاؤ فرحت، ڈرائنگ روم میں سے شیشیاں اور ڈبیاں لے آؤ۔ ہم اسی کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے اُن کا جائزہ لیں گے۔"

"میں اکیلی تو ہرگز اس کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ وہاں یشوما کی لاش پڑی ہے۔" فرحت نے کہا۔

"یشوما تمھیں کھا تو نہیں جائے گا۔" آفتاب نے جل کر کہا۔

"تو تم خود ہی کیوں نہیں اُٹھا لاتے؟" فرحت بھنک کر بولی۔

"بڑی کام چور ہو۔ جاؤ، آصف، تم اس کے ساتھ چلے جاؤ۔"

"اور تم نواب بنے یہاں آرام سے بیٹھے رہو۔" آصف نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"چلو، میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ اُمید ہے اب تم دونوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" آفتاب اُٹھتے ہوئے بولا۔

تینوں ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوئے اور یشوما کی طرف سے نظریں چُراتے ہوئے تپائی پر سے شیشیاں اور ڈبیاں اُٹھا لائے۔

"کیوں نہ پہلے ابّا جان کو اطلاع دے دیں کہ ہم گھر میں داخل ہو چکے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ٹیلے فون کام کرنے لگا ہے۔ ساتھ ہی یشوما کے متعلق ہدایات لے لیں گے۔" آفتاب نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" آصف بولا۔

کامران مرزا کو ایک بار پھر ٹیلے فون کیا گیا اور اُنھیں سب باتیں بتائی گئیں۔ پھر آفتاب کامران مرزا کی بات سُننے لگا۔ دونوں اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے آفتاب کا رنگ بدلتے دیکھا۔ اچانک اس کے مُنھ سے نکلا:

"نہیں"۔

یہ "نہیں" بہت خوف ناک لہجے میں کہا گیا تھا۔ کچھ دیر تک دوسری طرف کی بات سننے کے بعد آفتاب نے سوال کیا "کیا ہم ان چیزوں کا جائزہ لے سکتے ہیں؟"

کامران مرزا نے کچھ کہا اور سلسلہ بند کر دیا۔ آفتاب نے خاموشی سے ریسیور رکھا اور دونوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اس کی پلکیں کافی دیر تک بھی نہ جھپکیں تو وہ گھبرا گئے۔ آخر آصف نے پوچھا:

"کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟ کیا کوئی بری خبر سنی ہے؟"

"ہاں۔ بہت بری۔ یشوما کی لاش کے بارے میں ابا جان نے پولیس کو ہدایات دے دی ہیں۔ وہ تھوڑی دیر تک آکر اس کو لے جائے گی۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اس کے سینے سے وہ تیر نکالنا ہوگا اور اسے کاغذ میں لپیٹ کر رکھنا ہوگا۔"

"بھئی واہ! کتنی بری خبر ہے۔ میرا خیال ہے، ہم نے آج تک اتنی بری خبر کبھی نہیں سنی۔ کیوں آصف، کیا خیال ہے؟" فرحت نے اس کا مذاق اڑایا۔

"بالکل۔ یہ اس صدی کی سب سے بری خبر ہے۔"

"مذاق نہ اڑاؤ۔" آفتاب نے جھنجھلا کر کہا "اس وقت میں بہت سنجیدہ ہوں۔"

"ہمارے پاس اڑانے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے۔" فرحت مسکرائی۔

"بری خبر تم نے ابھی سنی ہی کہاں ہے۔"

"ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔ تم سناؤ بھی تو۔"

"سب انسپکٹر خالد اور اس کے ساتھی کانسٹیبلوں کا کوئی پتا نہیں۔ البتہ شمالی سڑک پر، سرحد سے تین میل ادھر ان کی جیپ ضرور ملی ہے۔ پورا شہر چھانا جا چکا ہے لیکن ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔ ابھی تلاش جاری ہے۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

دھوئیں کی لکیر

"اب ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔" آصف نے سوچتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے میز پر وہ شیشیاں اور ڈبیاں رکھی تھیں جو نمبر نو اور اُس کے ساتھیوں کے پاس سے برآمد ہوئی تھیں۔ منوّر علی خاں ابھی تک کامران مرزا کے ساتھ ہسپتال میں تھے اور اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ دن نکلنے میں اب بھی ایک گھنٹا باقی تھا۔ اُنھوں نے سوچا تھا کہ اب اس خوف ناک رات کا آخری ایک گھنٹا باقی رہ گیا ہے، اس لیے سو کر کیا کریں گے۔ وہ غور کرنے کے لیے اپنے کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

"مجھے تو اپنے سامنے ایک بھی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ یہ کمرا، کمرے میں تم دونوں اور میز پر یہ شیشیاں ضرور ہیں۔ نہ جانے تم کون سے دو راستوں کی بات کر

رہے ہو۔" آفتاب نے کہا۔

"اگر تم مذاق سے باز نہیں رہ سکتے تو اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ میں اور فرحت سوچ لیں گے۔" آصف نے جھلّا کر کہا۔

"کیا سوچ لو گے؟" آفتاب مُسکرایا۔

"یہی کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے، ان حالات میں کہ انکل ہسپتال میں ہیں اور ان کی ٹانگ کا آپریشن ہوا ہے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب مذاق نہیں کروں گا۔ اگر کروں تو تم اس کمرے سے کسی اور کمرے میں جا کر بیٹھ جانا۔ بلکہ سو جانا۔ جب میں تنہا رہ جاؤں گا تو پھر ظاہر ہے کہ کسی سے بھی کوئی مذاق نہیں کر سکوں گا اور..."

"بس، معلوم ہو گیا کہ تم سنجیدہ نہیں رہ سکتے۔" فرحت نے تلملا کر کہا۔

"معلوم ہو گیا؟ چلو، شکر ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تمھیں معلوم ہو جائے۔" آفتاب نے بدستور مُسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو فرحت، ہم دُوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔" آصف اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں ہاں، ضرور۔ چلو، میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔

اٹھاؤ یہ شیشیاں۔" آفتاب بھی اُٹھتے ہوئے بولا۔

دونوں کو بُری طرح غصّہ آ رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ جانتے، آفتاب جس قدر شریر ہے، اسی قدر تیز طرّار بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں اس سے اُلجھنے سے گھبراتے تھے۔

"تم خود کو نہ جانے کیا سمجھتے ہو۔" فرحت نے کہا۔

"میں اپنے آپ کو آفتاب سمجھتا ہوں اور تم دونوں بھی اچھی طرح سمجھتے ہو۔ ابّا جان اور انکل مُنوّر علی خان بھی سمجھتے ہیں۔ فضلو تک بھی یہ بات سمجھتا ہے۔ میں حیران ہوں، پھر تم یہ کہتے ہو کہ میں نہ جانے خود کو کیا سمجھتا ہوں۔ ویسے تم جو کہو، میں خود کو سمجھنا شروع کر دوں" آفتاب روانی سے بولتا چلا گیا۔

آصف آپے سے باہر ہو گیا۔ جب انسان آپے سے باہر ہو جاتا ہے تو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہی آصف کے ساتھ ہوا۔ غصّے میں وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے تیزی سے ایک مُکّا آفتاب کے سر پر دے مارا۔ آفتاب پہلے ہی ہوشیار تھا، فوراً نیچے جُھک گیا۔ آصف کا مُکّا فرحت کے کندھے پر اس زور سے پڑا کہ اسے تارے نظر آ گئے۔ وہ چلّائی:

"اوئی! میں مر گئی۔"

اپنے مُکّے کا یہ انجام دیکھ کر آصف پاگل ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آفتاب پر چھلانگ لگا دی۔ آفتاب چکنی مچھلی کی طرح پھسلتا ہوا اس کے نیچے سے نکل گیا اور آصف کا سر زور سے کمرے کے فرش سے ٹکرایا۔ دُوسری طرف فرحت کا غُصّہ آسمان سے باتیں کرنے لگا تھا۔ اس نے بھی عین اُسی وقت آفتاب پر چھلانگ لگائی تھی جب آصف نے لگائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آصف کے اُوپر آ گری۔ آصف کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ آفتاب دُور کھڑا مُسکرا رہا تھا۔

"بھئی واہ! تم دونوں کو تو سرکس میں مُلازم ہو جانا چاہیے۔ واقعی حیرت انگیز کارنامے آتے ہیں تم دونوں کو۔ چھلانگ لگاؤ مجھ پر اور گر پڑو ایک دُوسرے کے اُوپر۔ سرکس میں اگر یہ کمال دکھانے لگو تو سرکس والوں کی آمدنی کو چار چاند لگ جائیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"تمھاری زبان کاٹ کر مُلک کے سائنس دانوں کو تحفے میں دے دینی چاہیے وہ اس پر تحقیقات کریں گے اور اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دُنیا کی یہ واحد زبان ہے جو راکٹ کی رفتار سے چلتی ہے۔" فرحت نے کہا۔ آصف بھی اُٹھ کر کپڑے جھاڑنے لگا۔

"زبان کاٹ کر سائنس دانوں کو ضرور دے دینا مگر میرے مرنے کے بعد۔ اب اگر تم لوگوں کا جی ورزش سے سیر ہو چکا ہے تو ہم بیٹھ کر کام کی کچھ باتیں کر لیں" آفتاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کام کی باتیں اور تم کرو گے؟" آصف نے جھلا کر کہا۔

"ہاں، وہ تو صرف تم دونوں ہی کر سکتے ہو۔ ابھی ابھی کام کی باتیں ہی کر کے فارغ ہوئے ہو نا" آفتاب اب بھی باز نہیں آیا تھا۔

"اچھا بھائی، تم جیتے، ہم ہارے۔ آؤ، اب بیٹھ کر کچھ کام کر لیں" آصف نے کہا۔

"یہ ہوئی نا بات۔ تم مجھ سے جیت بھی کیسے سکتے ہو۔ تمھارا جب جی چاہے، مقابلہ کر لینا۔ لیکن بزدلوں کی طرح للکارے بغیر حملہ نہ کرنا۔ جس طرح اب کیا تھا۔ یاد رکھو، تم جب بھی للکارے بغیر حملہ کرو گے، اسی طرح ایک دوسرے کے اوپر گر پڑو گے"

دونوں نے تنگ آ کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"ہاں، اب آئے ہو سیدھے راستے پر۔ جب تک تم کانوں میں انگلیاں ٹھونسے رہو گے، میں کوئی بات مذاق والی

نہیں کروں گا۔ بس اسی حالت میں بیٹھ جاؤ۔ اب میں تم سے باتیں کرنے کے لیے تیار ہوں"

دونوں اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"ہمیں سب سے پہلے یشوما کی لاش سے تیر نکال لینا چاہیے۔ کیوں کہ وہ لوگ اسے اٹھانے کے لیے آنے ہی والے ہوں گے" آفتاب نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اسے اچانک خیال آیا تھا کہ وہ بہت وقت ضائع کر چکا ہے۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے" آصف نے کہا اور دونوں کانوں سے انگلیاں نکال لیں۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ کانوں سے انگلیاں نکال لو۔ چلو، خیر۔ دوبارہ انگلیاں ٹھونسنے میں وقت ضائع ہو گا۔ اس لیے آؤ، پہلے ڈرائنگ روم میں چلیں"

تینوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ یشوما ابھی تک اسی حالت میں بیٹھا تھا۔ آفتاب نے کہا:

"چلو آصف، اس کے سینے سے تیر نکال لو۔ لیکن خیال رہے، بہت احتیاط سے نکالنا۔ کہیں اس کی نوک تمھاری جلد سے چھو گئی تو تم بھی یشوما کی روح کے پیچھے روانہ ہو جاؤ گے۔ اور ہاں، تیر کو ہاتھ سے نہ نکالنا"

"تو کیا پیروں سے نکالوں؟" آفتاب نے کہا۔

"ناراض کیوں ہوتے ہو، بھائی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ کسی رُومال یا کاغذ سے پکڑ کر کھینچنا۔ ایسا نہ ہو کہ تیر پر نشانات ہوں اور وہ ضائع ہو جائیں۔"

"بہت اچھا، انسپکٹر صاحب!" آصف نے کہا اور جیب سے رُومال نکالنے لگا۔

اس نے رُومال کو اُنگلیوں پر لپیٹا اور تیر کو پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔ وہ بغیر کسی دِقّت کے نکل آیا۔ ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ تیر یشوما کے جسم کے اندر صرف آدھ انچ کے قریب گڑا تھا، یعنی اس کی کُل لمبائی صرف ڈیڑھ انچ تھی۔

ابھی وہ حیرت زدہ سے اس تیر کو دیکھ رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"یہ ضرور وہ لوگ ہوں گے جو یشوما کو لینے کے لیے آنے والے تھے۔" آصف بولا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دُشمنوں نے ایک بار پھر دھاوا بول دیا ہو۔" آفتاب نے خیال ظاہر کیا۔

"اب وہ کس لیے دھاوا بولیں گے۔ اب یہاں کون سا یشوما بیٹھا ہے کچھ بتانے کے لیے۔" فرحت نے بُرا سا مُنھ

بنا کر کہا۔

"بے وقُوف نہ بنو۔ وہ لوگ اس تیر اور ان شیشیوں کو واپس حاصل کرنے کے لیے آ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بہت اہم چیزیں ہوں۔" آفتاب نے کہا۔

"لیکن تم یہ کیوں بھُولتے ہو کہ دروازے پر چھ کانسٹیبل بھی موجُود ہیں۔"

"اُن کے لیے چھ کانسٹیبل کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتے۔ جن لوگوں کے پاس گیس پستول اور یہ ننھے تیر موجُود ہوں، چھ کانسٹیبل ان کا راستہ کیسے روک سکتے ہیں۔ یہ کیوں بھُولتے ہو کہ ان لوگوں کو یہاں سے باندھ کر روانہ کیا گیا تھا، اس کے باوجُود وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ نہ صرف کامیاب ہو گئے بلکہ انسپکٹر خالد اور اُن کے ساتھی ابھی تک غائب ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ نمبر نو مر چُکا ہے لیکن اس کے پانچ ساتھی اس وقت بھی شہر میں آزادی سے گھُوم رہے ہیں۔ اور یہ پانچ ہی کیوں، نہ جانے ان کے اور کتنے ساتھی یہاں کام کر رہے ہیں۔"

"اوہ! تمھارا خیال ٹھیک ہے۔" آصف نے کہا۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ "دروازے پر چاہے کوئی بھی ہو، ہمیں

احتیاطی تدابیر اختیار کر لینی چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے میں ابّا جان کو فون کرتا ہوں۔ تم اس تیر اور ان شیشیوں کو کسی ایسی جگہ چھپا دو جہاں سے یہ مل نہ سکیں۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا اور ہسپتال کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ فوراً ہی سلسلہ کامران مرزا سے مل گیا۔ آفتاب جلدی جلدی کہنے لگا:

"ابّا جان، دروازے پر کسی نے دستک دی ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ وہ لوگ ہوں جو یشوما کو لینے کے لیے آنے والے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دشمن ہوں اور تیر اور شیشیاں حاصل کرنے آئے ہوں۔ اگر کوئی خطرے والی بات نہ ہوئی تو ہم صرف پانچ منٹ بعد فون کریں گے۔ نہ کیا تو آپ سمجھ لیں کہ ہم خطرے میں ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ پانچ منٹ بعد اگر تمھارا فون نہ آیا تو میں تمھارے چچا منور علی خاں اور پولیس کو روانہ کر دوں گا۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"شکریہ، ابّا جان۔" آفتاب نے کہا اور سلسلہ بند کر دیا۔

اسی وقت آفتاب اندر داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ سب چیزوں کو چھپا کر رکھ چکا ہے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ چلو، دروازہ کھولیں۔" فرحت نے کہا۔

"کیوں نہ ہم میں سے صرف ایک جا کر دروازہ کھولے اور دو کسی جگہ چھپ جائیں۔" آصف نے مشورہ دیا۔

"بہت اچھی ترکیب ہے۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا "تم دونوں کہیں چھپ جاؤ۔ میں جا کر دروازہ کھولتا ہوں۔"

دروازہ دوبارہ کھٹ کھٹایا گیا۔ آفتاب خدا حافظ کہتا ہوا دروازے کی طرف چل پڑا۔ وہ دونوں چھپنے کی تیاری کرنے لگے۔ دراصل پوری رات واقعات کچھ اس تیزی سے پیش آئے تھے کہ اب وہ کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے یہ حفاظتی انتظامات کیے تھے۔

آفتاب نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا۔ دروازے پر اُسے حالات پُرسکون نظر آئے۔ کانسٹیبل جوں کے توں اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے، لیکن دروازے پر چار آدمی اور کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا:

"ہم سرکاری ہسپتال سے آئے ہیں۔ ہمیں ہدایت ملی ہے کہ یہاں ایک لاش موجود ہے۔ اسے ہسپتال پہنچانا ہے تاکہ اس کا پوسٹ مارٹم کیا جا سکے۔"

"اوہ! ہاں! ہم آپ کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ لیکن گاڑی کہاں کھڑی ہے؟"

"گاڑی بڑی ہے۔ گلی میں اسے لانا مشکل تھا، سڑک کے کنارے چھوڑ آئے ہیں۔"

آفتاب نے دیکھا، اُن کے جسموں پر ہسپتال کی وردی تھی۔ وہ مطمئن ہو گیا اور اُنھیں راستہ دیتے ہوئے بولا "اندر آ جائیے۔"

وہ اُنھیں لیے ڈرائنگ رُوم کی طرف چل پڑا۔ ساتھ ہی اس نے بلند آواز میں کہا "آصف، فرحت، تم کہاں ہو؟ یہ لوگ بشوما کی لاش لینے آئے ہیں۔"

"ہم ابھی آتے ہیں۔" اندر سے آصف کی آواز سُنائی دی۔

دراصل یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ کامران مرزا کو فون کر کے بتا دیا جائے کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آصف نے جلدی جلدی فون کر کے کامران مرزا کو اِطلاع دی اور فرحت کو ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

"آپ تینوں کے عِلاوہ یہاں کوئی نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ ایک مُلازم ضرور ہے جو سو رہا ہے۔ لیکن ہم ہر طرح آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ۔ ہم ایمبولنس میں سے اسٹریچر لے آئیں۔ اس پر لاش کو رکھ کر لے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم یہیں ٹھہرتے ہیں۔" آفتاب بولا۔

"ارے! یہ کمرے کے فرش پر کیا پڑا ہے؟" اُن میں سے ایک نے چونک کر کہا۔

تینوں بچّے فرش پر اس جگہ دیکھنے لگے جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ اُنھیں وہاں کوئی سُرخ سی چیز پڑی نظر آئی۔ تینوں اس پر جُھک گئے۔ یہ کیا چیز تھی، وہ سمجھ نہ سکے۔ اس کی شکل کیچوے جیسی تھی لیکن وہ بے حرکت پڑی تھی۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس میں سے دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر نکلنے لگی تھی۔

اچانک اُنھوں نے اپنے سر چکراتے محسوس کیے اور دُوسرے ہی لمحے وہ دھڑام سے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئے۔

تین تارا

آفتاب کی آنکھ کھُلی تو اس نے دیکھا کہ وہ رسّیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک ہی فرش پر کانسٹیبل بھی بندھے پڑے تھے۔ ان کے ساتھ یہ رعایت کی گئی تھی کہ انھیں کرسیوں پر بٹھا کر باندھا گیا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ مُعاملہ کیا ہے اور اُن کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے! پھر رفتہ رفتہ اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔ آخری بات جو اسے یاد آئی، وہ یہ تھی کہ فرش پر پڑی کیچوے کی شکل کی سُرخ سی چیز پر وہ جھکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں سے دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر نکلنے لگی۔ بس پھر اُن کے سر چکرائے تھے اور وہ گر پڑے تھے۔

اس نے اِرد گرد دیکھا۔ دائیں طرف دو کرسیوں سے آصف اور فرحت بندھے ہوئے تھے اور ابھی تک بے ہوش تھے۔ البتہ کانسٹیبل ہوش میں تھے اور اِدھر اُدھر لڑھکتے

پھر رہے تھے۔ شاید ان پر دھوئیں کی لکیر نہیں آزمائی گئی تھی۔ انھیں کسی بہانے سے باری باری اندر بُلایا گیا ہوگا۔ انھیں فرش پر لڑھکتے دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔

اسے ہنسی کیا آئی، وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ اس کی آواز سُن کر آصف اور فرحت کو بھی ہوش آ گیا۔ اُنھوں نے کب کو بُری طرح ہنستے دیکھا تو خود بھی سوچے سمجھے بغیر ہنسنے لگے۔ پھر ان کے قہقہے بلند ہوتے چلے گئے اور انھیں کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کانسٹیبل انھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک گرج دار آواز نے ان کی ہنسی میں بریک لگا دیے

"خاموش!!"

وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ انھیں اپنے سامنے وہ چاروں بیٹھے نظر آئے جو یشوما کی لاش لینے آئے تھے۔ یشوما کا خیال آتے ہی اُنھوں نے گردنیں موڑ کر اُس کرسی کی طرف دیکھا جس پر وہ بیٹھے بیٹھے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گیا تھا۔ وہاں اب اُس کی لاش موجود نہ تھی۔

"کیا آپ لوگ یشوما کی لاش ہسپتال چھوڑ آئے ہیں؟" آفتاب نے ہوش میں آتے ہوئے پُوچھا۔

"ہاں۔ تم اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ اسے

جہاں جانا چاہیے تھا، وہاں پہنچا دیا گیا۔"

"بہت خوب! تم تو بہت ذمّے دار ہو۔ ذرا ہمارے ابّو کو فون کر کے بتا دو کہ ہم یہاں خیریّت سے ہیں اور اُن کی خیریّت نیک چاہتے ہیں۔"

"خاموش رہو۔"

"میں تو تمّھارے فائدے کی بات کر رہا تھا۔ اگر تم فون کر دو گے تو وہ مطمئن ہو جائیں گے اور تم لوگ بھی اپنا کام اطمینان سے کر سکو گے۔" آفتاب نے دل ہی دل میں مُسکراتے ہوئے کہا۔ آصف اور فرحت بھی اس کی چالاکی پر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"ہم اتنے بے وقوف نہیں کہ فون کر کے خطرے کو آواز دیں۔"

"تو پھر کتنے بے وقوف ہو، ہمیں بتا دو تاکہ ہم اسی کے مطابق کوئی ترکیب سوچ سکیں۔" آفتاب نے کہا۔

"بکو مت۔ اگر اب تم نے ایک لفظ بھی مُنھ سے نکالا تو گدّی سے زبان کھینچ لوں گا۔" ایک نے غرّا کر کہا۔ آفتاب نے اسے مسکرا کر دیکھا لیکن مُنھ سے کچھ نہ بولا۔

"یہ بتاؤ، وہ تیر اور وہ شیشیاں کہاں ہیں؟" اس نے پُوچھا۔ تینوں جواب میں خاموش رہے۔ آخر وہ چلّا کر بولا:

"میرا نام نمبر ایک ہے اور میں تمھیں وہ مزا چکھاؤں گا کہ ساری زندگی یاد کرو گے۔ مُنگنی کا ناچ نہ نچایا تو میرا نام بدل دینا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس صُورت میں ہم تمّھارا نام نمبر زیرو رکھ دیں گے۔ کیا خیال ہے؟ اچھّا نام رہے گا نا؟" فرحت نے مُسکرا کر کہا۔

"اس مکان میں اس وقت تک جو کچھ ہوا ہے، اس کی رپورٹ مجھے مِل چکی ہے۔ تمّھارے اور تمّھارے باپ کے بارے میں بھی سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ یشوما کی لاش تو ہم حاصل کر چکے ہیں۔ اب صرف تیر اور ڈبیاں حاصل کرنا ہیں۔ انھیں حاصل کرنے کے بعد ہمیں تم لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ ہم چُپ چاپ یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس لیے تمّھارے لیے بہتر یہی ہے کہ فوراً ہمیں بتا دو کہ وہ چیزیں تم نے کہاں چھپائی ہیں؟"

"اس سے پُوچھو۔ یہ تم لوگوں کو بتائے گا کہ وہ چیزیں کہاں ہیں۔" آصف نے آفتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ، کہاں ہیں وہ چیزیں؟"

آفتاب اس پر بھی خاموش رہا۔ نمبر ایک جھلاّ اُٹھا۔ "اگر تم نہ بولے تو تمھیں سخت سزا دوں گا۔"

"میں اپنی زبان گدّی سے کھنچوانا نہیں چاہتا۔" آفتاب بولا۔

"کیا مطلب؟" نمبر ایک چونکا۔

"تم نے خود ہی تو کہا ہے، اگر میں نے ایک لفظ بھی مُنھ سے نکالا تو زبان گدّی سے کھینچ لو گے۔ معاف کرنا، مجھے اپنی زبان بہت پیاری ہے۔ اس سے میں اپنی مادری زبان بولتا ہوں، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اسے گدّی سے کھینچ لیا جائے۔"

"بکو مت! وہ تو میں نے تمھاری بکواس بند کرنے کے لیے کہا تھا۔ اب کہ میں خود تم سے کچھ پُوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو۔"

"بہت اچھا۔ میں جواب ضرور دوں گا۔ بتاؤ، تم کیا پُوچھنا چاہتے ہو؟"

"عجیب اُلّو ہو۔ تم جانتے تو ہو کہ ہم کیا پُوچھنا چاہتے ہیں۔"

"میری یادداشت ذرا کمزور ہے۔ ارے! تم نے کیا کہا؟ عجیب اُلّو؟ اپنے الفاظ واپس لو، ورنہ....."

"ورنہ کیا؟" نمبر ایک نے غرّا کر کہا۔

"ورنہ یہ کہ میں تمھیں تیر اور شیشیوں کے بارے میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں

مگر اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

"بکو مت! فوراً بتاؤ!"

"نہیں بتاتا۔ پہلے اپنے الفاظ واپس لو۔" آفتاب نے بھی اڑتے ہوئے کہا۔

"لے لو بھائی، اپنے الفاظ واپس لے لو۔ یہ بہت ضدّی ہے۔ اس وقت تک کچھ نہیں بتائے گا جب تک تم اس کی بات نہیں مان لوگے۔" آصف نے ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" اس نے خوں خوار لہجے میں کہا۔

"بہت خوب! اب پُوچھو، کیا پُوچھنا چاہتے ہو؟"

"وہ تیر اور شیشیاں کہاں ہیں؟"

"کون سے تیر اور شیشیاں؟" آفتاب نے چہرے پر حیرت طاری کرتے ہوئے کہا۔

"تیر جو یشوما کے سینے میں لگا تھا۔ شیشیاں اور ڈبیاں جو نمبر نو، دس اور گیارہ کی جیبوں سے نکلی تھیں۔" اس نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"اوہ! تو تم ان کی بات کر رہے ہو۔ میں کچھ اور سمجھا تھا۔"

"چلو، اب تو سمجھ گئے ہو نا؟ بتاؤ، کہاں ہیں وہ؟"

"یہ چیزیں ہم نے ان کانسٹبلوں کے حوالے کر دی تھیں۔ انھیں سے معلوم کر لو۔" آفتاب نے کہا۔ در اصل وہ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا تاکہ مدد آ جائے، ورنہ بندھی ہوئی حالت میں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

نمبر ایک یہ سُن کر فوراً ایک سپاہی کی طرف مُڑا اور چلّا کر بولا "تو وہ چیزیں تمھارے پاس ہیں؟ بتاؤ کہاں ہیں؟"

"یہ جھوٹ کہتا ہے۔ انھوں نے ہمیں کوئی چیز نہیں دی۔"

"کیا یہ سچ ہے؟" اس نے دُوسرے کانسٹبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

کانسٹبلوں نے اپنے سر زور زور سے ہلائے۔ نمبر ایک کو غُصّہ آ گیا۔ اس نے آفتاب کی طرف مُڑتے ہوئے کہا:

"تم جھوٹے ہو۔ لیکن تمھارا جھوٹ تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

عجیب آدمی ہو! کانسٹبلوں کے مقابلے میں مجھے جھوٹا کہتے ہو۔ کہو تو قسم کھا کر کہہ دُوں کہ مجھے نہیں معلوم۔"

"میں جانتا ہوں۔ یہ کانسٹبل جھوٹ نہیں بول سکتے۔ جھوٹے تم ہو۔"

"اچھا بھائی، میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ میں جھوٹا ہوں۔ بس تم یہی چاہتے ہو نا؟ لو، اب ہمیں کھول دو۔" آفتاب نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"بکواس نہ کرو۔ جب تک تم ان چیزوں کے بارے میں نہ بتاؤ گے، ہم تمھیں ہرگز نہیں کھولیں گے۔"

"جب تک تم ہمیں کھولو گے نہیں ہم کچھ نہیں بتائیں گے۔" آفتاب نے بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔

"یہ یُوں نہیں مانے گا۔" نمبر ایک نے جھنجھلا کر اپنے ساتھیوں کی طرف مُڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ انھیں بتاؤ، میں کیسے مانوں گا بلکہ ذرا مجھے بھی بتا دو کیوں کہ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا۔"

"ابھی جان جاؤ گے۔" اس نے تلملا کر کہا۔ پھر اپنے ایک ساتھی سے بولا "ذرا تین تارا نکالنا۔ میں اسے ابھی چھٹی کا دُودھ یاد دلاتا ہوں۔"

"تین تارا؟ بھئی واہ! کیا نام ہے۔ دو تارا ساز کے بارے میں تو ہم جانتے ہیں۔ اس پر بڑی میٹھی دُھن بجائی جاتی ہے۔ ویسے میں خود بھی بجا لیتا ہوں۔ البتہ تین تارا سُننے کا اتّفاق آج تک نہیں ہوا۔ میں نے تو اس ساز کا نام ہی آج سُنا ہے۔ میں اور میرے ساتھی تمھارے۔

بہت بہت شکر گزار ہیں کہ تم ہمیں ایک نئی چیز دکھا رہے ہو۔"

اتنی دیر میں نمبر ایک کا ساتھی چرخی نما ایک مشین نکال چکا تھا۔ اس میں تین تار لگے ہوئے تھے۔

"یہ اس کی دائیں پنڈلی سے باندھ دو۔ اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ یہ کب تک خاموش رہتا ہے۔"

"میں تو شروع سے اب تک بول رہا ہوں۔ خاموش تو ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ہوا۔" آفتاب نے گھبراہٹ ظاہر کیے بغیر کہا۔ ویسے وہ سمجھ گیا تھا کہ تین تارا تکلیف پہنچانے کا کوئی نیا آلہ ہے۔

تین تارا اس کی پنڈلی سے باندھ دیا گیا۔ تین تار اس کی پنڈلی کے گرد لپٹ چکے تھے۔ تینوں کے درمیان ایک ایک انچ کا فاصلہ تھا۔

"اب ذرا اس چرخی کو گھماؤ تاکہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کس طرح کام کرتا ہے۔"

"آفتاب، جب تمھیں معلوم ہو جائے کہ یہ کس طرح کام کرتا ہے تو ہمیں بتا دینا۔" آصف نے اس طرح خوش ہوتے ہوئے کہا جیسے وہ کسی نئی ایجاد کے بارے میں جاننے والے ہوں۔

"اچھا، صبر کرو۔ پہلے تمھیں ہی بتاؤں گا۔" آفتاب بولا۔

"چرخی گھماؤ۔" نمبر ایک نے اپنے ساتھی سے کہا، اور اس نے آہستہ آہستہ چرخی گھمانا شروع کر دی۔

آفتاب کو تین تار اپنے گوشت میں دھنستے محسوس ہوئے۔ کچھ دیر تک تو وہ برداشت کرتا رہا۔ آخر جب معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"بھئی واہ! مزا آگیا۔"

اس کی یہ بات سن کر آصف اور فرحت سمجھ گئے کہ اب آفتاب سے تکلیف برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ فرحت ایک دم چلائی:

"کتنے عقل مند لوگ ہیں۔ جسے یہ معلوم تک نہیں کہ وہ چیزیں کہاں ہیں، اس سے پوچھ رہے ہیں۔ حالاں آں کہ تم لوگ جس وقت آئے تھے، یہ دروازہ کھولنے گیا تھا اور میں نے وہ چیزیں چھپائی تھیں۔"

نمبر ایک اور اس کے ساتھی چونک اٹھے۔ آخر نمبر ایک نے جھنجھلا کر کہا "تین تارا اس باتونی لڑکی کی پنڈلی سے باندھ دو۔"

"نہیں نہیں، یہ کچھ نہیں جانتی۔ یہ جھوٹ بول رہی

ہے۔ اسے ان چیزوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔
یہ بات تو میں ہی جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔ تم اپنے
تین تارے کو اور گھماؤ۔ شاید میں بتا ہی دوں" آفتاب
آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔ وہ ڈر گیا تھا کہ فرحت تکلیف
برداشت نہیں کر سکے گی۔ لیکن نمبر ایک کو اس کی بات
پر یقین نہ آیا۔ اس نے کہا:
"سوچتے کیا ہو؛ آلہ لڑکی کی ٹانگ سے باندھ دو"
آلہ فرحت کی پنڈلی کے گرد لپیٹ دیا گیا اور چرخی
گھمائی جانے لگی۔ آفتاب اور آصف بے بسی کے عالم میں
اسے دیکھنے لگے۔ فرحت کے چہرے کا رنگ سرخ ہوتا
جا رہا تھا۔ وہ ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھی۔ چرخی بدستور
گھمائی جا رہی تھی۔ فرحت کی پنڈلی کا گوشت تاروں کی
درمیانی جگہ میں ابھر رہا تھا اور تار اندر گھس رہے تھے۔
اس کے منہ سے دبی دبی کراہیں نکلنے لگیں۔ اب آصف
سے رہا نہ گیا اس نے چلّا کر کہا:
"بس کرو، ظالمو! میں تمھیں بتاتا ہوں کہ وہ چیزیں کہاں
ہیں۔ انھیں میں نے چھپایا ہے"
چرخی گھمانے والے کے ہاتھ رک گئے۔ نمبر ایک نے
آصف کو گھور کر دیکھا اور پھر پھنکارنے کے انداز میں بولا:

"بتاؤ، ورنہ میں تمھارا خون پی جاؤں گا"
"اے آدم خور، پہلے اس لڑکی کی پنڈلی سے اپنا یہ
آلہ ہٹا دے"
"آلہ نہیں اتارا جائے گا۔ اسی حالت میں بتاؤ"
"تو پھر سن لو۔ ان چیزوں کے بارے میں اس وقت صرف
مجھے معلوم ہے، اور میں تمھیں اس وقت تک نہیں بتاؤں
گا جب تک تم آلہ اس کی پنڈلی سے نہیں ہٹاؤ گے۔ اگر
تم چرخی گھماؤ گے تو ہم دونوں آنکھیں بند کر لیں گے
اور اس طرح ہم اس کی حالت سے بے خبر رہیں گے۔
آفتاب آنکھیں بند کر لو۔ یہ فرحت کے اور ہمارے امتحان کا
وقت ہے" آصف نے کہا۔
"اور ہم آج تک کسی امتحان میں فیل نہیں ہوئے،
بلکہ ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئے ہیں۔ لو، ہم آنکھیں
بند کر رہے ہیں۔ اب تمھارا جو جی چاہے کرو" آفتاب نے
کہا اور آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ آصف نے بھی ایسا ہی
کیا۔
کانسٹیبل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تینوں کو اس طرح دیکھ
رہے تھے جیسے وہ اس دنیا کے انسان نہ ہوں، کسی دوسری
دنیا کی مخلوق ہوں۔ نمبر ایک بھی اس موقع پر چکرا کر رہ

گیا۔ آخر اس نے اپنے ساتھی کو آلہ کھول دینے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ آصف کی طرف مڑا۔

"آلہ کھول دیا گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اب تم شرافت سے بتادو گے۔"

"مگر تمھارا نام شرافت کب ہے۔ تم تو نمبر ایک ہو۔" آصف نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"میرا اصلی نام شرافت ہے۔" نمبر ایک نے اسے گھورا۔

"تو نمبر ایک تمھارا نقلی نام ہے؟ ہاں، تو مسٹر نقلی نمبر ایک .... یہاں سے ایک ہزار تین میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس جزیرے میں ایک اور چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ مطلب یہ کہ پہلے چھوٹے سے جزیرے کے اندر بھی چاروں طرف پانی ہے۔ اس طرح اس کے اندر ایک اور جزیرہ بن گیا ہے۔ تو اس چھوٹے سے جزیرے میں ایک بن مانس رہتا ہے۔ یہ بن مانس آدم خور ہے اور اس وقت تک نہ جانے کتنے انسانوں کو کھا چکا ہے۔ ننھا تیر اور وہ شیشیاں جن کی تلاش میں تم ہو، اس کے پیٹ میں محفوظ ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تمھارا انوکھا تیر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا۔ وہ بن مانس ہمارا تسکر گزار ہے، کیوں کہ ایک مرتبہ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا

تھا اور وہ کانٹا ہم نے نکالا تھا۔ اس وقت سے وہ ہمارا بے دام غلام بن چکا ہے۔ ہم نے تمھاری چیزیں اُس کے حوالے کر دی ہیں۔ جاؤ، اس کے سامنے جا کر ہمارا نام لو۔ وہ چیزیں فوراً اُگل دے گا۔" آصف یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"آصف! تم نے بہت بُرا کیا۔ بہت بُرا۔ میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" آفتاب نے غصّے سے کہا۔

"کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے ان چیزوں کا اتنا صحیح پتا ان لوگوں کو کیوں بتایا؟ اب یہ لوگ جا کر آسانی سے انھیں حاصل کر لیں گے۔"

"مرتا کیا نہ کرتا۔ بتانا ہی پڑا۔ اب ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ صبر کریں۔ کیوں کہ اس کا پھل ضرورت سے کچھ زیادہ ہی میٹھا ہوتا ہے۔" آصف نے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔

"میں بھی تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اس تین تارے جیسے معمولی آلے سے ڈر کر بتا دیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں تمھیں اتنا بزدل نہیں سمجھتی تھی۔" فرحت نے بُرا سا منھ بنا کر کہا۔

نمبر ایک اور اُس کے ساتھیوں کا مارے غُصّے کے بُرا حال تھا۔ آخر نمبر ایک نے غرّا کر کہا "تم بکواس کر چکے؟"

"اگر یہ تمھارے نزدیک بکواس تھی تو واقعی ہم کر چکے ہیں۔" آفتاب نے کہا۔

"تب پھر اپنے ساتھی کا عبرت ناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تین تارا اس کی پنڈلی سے باندھ دو تاکہ اسے اتنی لمبی چوڑی بکواس کا مزا چکھایا جا سکے۔"

اس کے ساتھی نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور آلہ آصف کی پنڈلی سے باندھ دیا۔ اس کے بعد چرخی گھمانے لگا۔ آصف کو واقعی مزا آگیا۔ اسے اپنی جان پنڈلی کے راستے نکلتی محسوس ہونے لگی۔ تاہم اس نے اپنے لبوں سے کوئی سسکی، کوئی آہ نہ نکلنے دی۔ ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا۔

"آصف! خدا کے لیے انھیں بتا دو کہ وہ چیزیں کہاں ہیں۔" آفتاب گھبرا گیا۔

"مجھے کیا معلوم کہ کہاں ہیں۔ تم خود ہی انھیں بتا دو نا۔" آصف نے اسے بُری طرح گھورا۔

"ارے بابا، کیا تم بھول گئے؟ وہ تم نے ہی تو چھپائی تھیں۔"

"میں نے چھپائی تھیں؟ یہ تم کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ یہ میں کہہ رہا ہوں۔"

"غلط کہہ رہے ہو۔ مجھے نہیں معلوم، وہ کہاں ہیں؟"

چرخی برابر کسی جا رہی تھی اور آفتاب کی جان پہ بنی ہوئی تھی۔ اچانک آفتاب اور فرحت نے اس کی پنڈلی سے تین جگہوں سے دائروں کی شکل میں خون نکلتے دیکھا۔

ان کے چہرے سُت گئے۔ عین اسی وقت صُبح کی اذان کی آواز اُن کے کانوں سے ٹکرائی۔ ہنگاموں سے بھری رات ختم ہو رہی تھی اور صُبح کا پیغام ان کے کانوں میں اذان کی صُورت میں آ رہا تھا۔

آمنا سامنا

فضلو صبح کی اذان ہوتے ہی اُٹھ جاتا تھا۔ وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔رات کے ہنگاموں میں وہ نمبر نو اور اس کے ساتھیوں کے گرفتار ہونے تک شریک رہا تھا۔ اس کے بعد جب کامران مرزا سیکرٹری صاحب کو بُلانے کے لیے روانہ ہوئے تو سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ فضلو بھی اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔اس کا کمرا گھر کے پچھلے حصّے میں تھا،اس لیے اس کے بعد جو واقعات پیش آئے، وہ ان سے بے خبر پڑا سوتا رہا تھا۔

اس نے وُضو کر کے نماز پڑھی اور باورچی خانے کی طرف چل پڑا۔ وہ ڈرائنگ رُوم کے پاس سے گزُرا تو اسے اندر سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنے سویرے کون ہے جو ڈرائنگ رُوم میں باتیں کر رہا ہے۔ اس کے خیال میں تو اس وقت سب کو

اپنے اپنے کمروں میں ہونا چاہیے تھا۔ دروازہ اگرچہ بند تھا لیکن اندر سے چٹخنی نہیں لگی ہوئی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔اس طرح پیدا ہونے والی باریک سی جھری میں اسے اندر ایک خوف ناک منظر دکھائی دیا۔ اس پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس نے دیکھا کہ آفتاب، آصف اور فرحت کُرسیوں سے بندھے ہوئے ہیں اور ان کے پاس چار آدمی ہسپتال کے لباس میں کھڑے ہیں۔ان میں سے ایک آصف کی ٹانگ پر جھکا ہوا ہے.....اور آصف کی ٹانگ سے خون نکل رہا ہے۔

اس کے ہوش اُڑ گئے ابھی اس کی نظر فرش پر نہیں پڑی تھی۔ اس لیے وہ کانسٹبلوں کو نہ دیکھ سکا۔ وہ دبے پاؤں واپس پلٹ آیا۔ اس کا رُخ کامران مرزا کے کمرے کی طرف تھا۔ اندر داخل ہونے پر ایک بار پھر اس کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ کمرا خالی تھا۔ اس نے سوچا شاید وہ مُنوّر علی خان کے کمرے میں شطرنج کھیلتے کھیلتے سو گئے ہوں۔ وہ اُن کے کمرے کی طرف گیا۔ یہ کمرا بھی خالی تھا۔اب تو وہ بُری طرح چکرا گیا۔حالات اس کی سمجھ سے باہر تھے۔آخر اُس نے ایک فیصلہ کیا

اور سیدھا کامران مرزا کے کمرے میں آیا۔ یہاں تپائی پر ٹیلے فون رکھا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں اندر سے بند کر لیں۔ اس کے بعد تھانے فون کرنے لگا۔ تھانے میں اس کا پیغام حیرت بھرے انداز میں سُنا گیا۔ بلکہ یہ بھی پُوچھا گیا کہ کیا دروازے پر چھ کانسٹیبل موجُود نہیں ہیں؟ فضلو نے کہا کہ اسے نہیں معلوم۔ بہر حال حالات نازک صُورت اختیار کر چکے ہیں۔ سب انسپکٹر، جو پہلے بھی رات کے وقت آ چکا تھا اور کسی قدر حالات سے واقف تھا، گھبرا گیا۔ اس نے فوراً پہنچنے کا وعدہ کیا۔

اِس سب انسپکٹر کا نام ریاض تھا۔ اس نے سب سے پہلے ہسپتال کو فون کر کے معلوم کیا کہ اس کا عملہ ایک شخص یشوما کی لاش لینے کے لیے کامران مرزا کے گھر کی طرف روانہ کیا گیا تھا یا نہیں؟ ہسپتال میں ڈیوٹی پر موجُود افسر نے بتایا کہ چار آدمیوں کو رات کے پچھلے پہر روانہ کیا گیا تھا مگر ابھی تک وہ چاروں لاش کو لے کر نہیں پہنچے۔ اس پر وہ خود بھی حیران ہو رہا ہے۔

یہ خبر سُن کر سب انسپکٹر ریاض کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے جلدی جلدی کامران مرزا کو فون پر مختصر لفظوں میں حالات سُنائے اور یہ بتاتے ہوئے کہ وہ کچھ آدمیوں

کو لے کر جا رہا ہے، سلسلہ بند کر دیا۔

کامران مرزا نے یہ حیرت انگیز خبر مُنوّر علی خاں کو سُنائی جو ان کے قریب ہی کُرسی پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ یہ خوف ناک خبر سُن کر مُنوّر علی فوراً ہسپتال سے نکل آئے۔ اُنھوں نے موٹر سائیکل سنبھالی اور گھر کی طرف پُوری رفتار پر دوڑا دی۔

مُنوّر علی خاں پولیس کے آدمیوں سے پہلے گھر پہنچ گئے۔ اُنھوں نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اب تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں کہ اسی وقت پولیس کی جیپ آ کر رُکی اور سب انسپکٹر ریاض چھلانگ مار کر اس پر سے اُترا۔ اس کے ساتھ کچھ کانسٹیبل بھی تھے۔

"آپ شاید ہسپتال سے آ رہے ہیں"، سب انسپکٹر ریاض نے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ لیکن اب ہم کیا کریں؟ دروازہ اندر سے بند ہے"۔

"اوہ! کیا آپ پائیں باغ والی کھڑکی دیکھ چکے ہیں؟" ریاض نے پُوچھا۔

"جی، نہیں تو۔"

عین اسی وقت چٹخنی گرنے کی ہلکی سی آواز سُنائی دی۔ وہ چونک اُٹھے۔ دروازہ آہستہ آہستہ کھلا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا، دروازہ فضلو نے کھولا تھا۔

وہ فضلو کی اس عقل مندی پر کھِل اُٹھے۔ دبے پاؤں اندر داخل ہوئے اور ڈرائنگ رُوم کی طرف قدم اُٹھانے لگے۔

آصف کی ٹانگ سے خُون بہتا دیکھ کر آفتاب کی آنکھوں میں شُعلے سے بھڑک اُٹھے۔ اس نے چِلّا کر کہا:

"بند کرو یہ کھیل۔ ہم تمھیں ان چیزوں کا پتا بتانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن یاد رکھو، تم ان چیزوں کو لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ دن نکل چکا ہے۔ مُصیبت کی یہ رات ختم ہو چکی ہے، اور اب ہم وہ چیزیں تمھارے حوالے کر بھی دیں تو بھی تم انھیں یہاں سے نہیں لے جا سکو گے۔"

نمبر ایک نے اس کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ پھر اپنے ساتھی کو روکتے ہوئے بولا "تو تم بتانے پر تیار ہو گئے ہو۔ ہم جانتے تھے کہ یہ خُوش کُن منظر تم سے دیکھا نہ جائے گا، چلو، اب بتاؤ، وہ چیزیں کہاں ہیں؟"

"آصف! میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ اِن لوگوں کو ان چیزوں کا پتا بتا دو۔"

آصف نے یہ سُن کر فرحت کی طرف دیکھا اور اس سے پُوچھا "تم بتاؤ۔ تم کیا کہتی ہو؟"

"اِن حالات میں ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ آخر ہم کب تک ان کے مظالم سہہ سکیں گے۔ میں تو یہی کہتی ہوں کہ بتا دو۔ ہم نے اس وقت تک ان چیزوں کو بچانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ شاید کوئی اور ہوتا تو اتنا بھی نہ کر سکتا۔"

"تو تم یہ کہتے ہو کہ میں انھیں بتا دوں؟"

"ہاں، ہمارا فیصلہ یہی ہے۔ مجھے یقین ہے، ابّا جان ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم دونوں اپنا فیصلہ سُنا چکے۔ اب میں ان لوگوں کو اپنا فیصلہ سُناتا ہوں۔ تم چاروں کان کھول کر سُن لو۔ ان چیزوں کو صرف میں نے چھُپایا ہے اور میں تمھیں ان کا پتا ہرگز ہرگز نہیں بتاؤں گا۔" آصف نے چٹان کی طرح مضبُوط لہجے میں کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ تین تار تمھاری ہڈّی تک اُتر جائیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ تم کب تک نہیں بتاتے۔

چرخی گھماؤ۔" نمبر ایک نے سخت لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں۔ آصف، خدا کے لیے انھیں بتا دو۔ ہم تم پہ ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔" آفتاب نے چلّا کر کہا۔

"تو نہ دیکھو۔ آنکھیں بند کر لو۔" آصف نے کہا۔

"چرخی گھماؤ۔ یہ اِس طرح نہیں مانے گا۔" نمبر ایک چلّایا۔

"ہاں۔ چرخی گھماؤ۔ میں اس طرح نہیں مانوں گا۔" آصف نے اُس کی نقل اُتاری۔

"ٹھہرو! میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں۔" آفتاب نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ چرخی والے کے ہاتھ بھی رُک گئے۔

"یہ بہت ضدی ہے۔ یہ ہرگز نہیں بتائے گا، لیکن ہم اتنا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں کہ اس نے چیزیں کہاں چھپائی ہیں۔ اگر تم منظور کرو تو ہم دونوں جا کر انھیں تلاش کریں؟"

"ہرگز نہیں۔ میں تمھیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔" آصف نے کہا۔

"تم اس کی بات چھوڑو۔ اگر تمھیں یہ شرط منظور

ہے تو ہمیں کھول دو۔ ہم چند منٹوں کے اندر وہ چیزیں تمھیں لا کر دے سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر میرے دو آدمی تمھارے ساتھ جائیں گے۔" نمبر ایک نے کہا۔

"ہمیں منظور ہے۔" آفتاب بولا۔

آصف نے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ اس کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ دراصل آفتاب کی سکیم کیا ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ایک بار وہ دونوں آزاد ہو گئے تو کچھ نہ کچھ کر سکیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ یوں لگا جیسے اُسے سانپ سُونگھ گیا ہو۔

دُوسری طرف نمبر ایک کے دو ساتھی آفتاب اور فرحت کو کھول رہے تھے۔ دونوں نے آزاد ہو کر انگڑائیاں لیں اور سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد آفتاب نے کہا:

"اپنے دو ساتھی ہمارے ساتھ کر دو۔"

دونوں نے ڈرائنگ رُوم کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔ ان کے پیچھے نمبر ایک کے دو ساتھی تھے۔ آفتاب اپنے ذہن کو تیزی سے گردش دے رہا تھا کہ ان دونوں

سے کیسے نپٹا جائے؟

وہ ڈرائنگ رُوم سے نکل کر مُڑے ہی تھے کہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ ان کے سامنے مُنوّر علی خاں پولیس کے آدمیوں کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔

ہسپتال میں

مُنوّر علی خاں اور اُن کے ساتھی بھی رُک گئے۔ سب انسپکٹر ریاض نے فوراً ریوالور نکالا اور اُن دونوں کی طرف تان دیا۔ نمبر ایک کے ساتھی اس اچانک تبدیلی پر گھبرا کر رہ گئے۔ ان کے ہاتھ خود بخود اُوپر اُٹھ گئے۔ آفتاب نے اشارے سے سب انسپکٹر کو بتایا کہ انھیں یہاں سے دُور لے جا کر گرفتار کیا جائے۔ وہ سمجھ گئے۔ یُوں بھی وہ اُنھیں ڈرائنگ رُوم سے نکلتے دیکھ چکے تھے۔

ریاض نے پستول کی نال سے انھیں آگے بڑھنے کا حُکم دیا۔ وہ چُپ چاپ آگے بڑھنے لگے، یہاں تک کہ کامران مرزا کے کمرے میں آ گئے۔ آفتاب نے کہا:

"دوستو، وہ چیزیں اسی کمرے میں ہو سکتی ہیں، لیکن افسوس کہ اب ہم ان کو تلاش نہیں کر سکتے کیوں کہ ظُلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ تم جس قدر ظُلم توڑ سکتے تھے، توڑ چکے۔ اب ہماری باری ہے۔ لیکن ہم تم پر ظُلم

نہیں ڈھائیں گے۔ یہ ہمارا دستور نہیں۔"

"ان لوگوں کو دُور رہ کر گرفتار کرنا ہے۔" منوّر علی خاں نے سب انسپکٹر ریاض کے کان میں کہا۔ ریاض نے سر ہلایا اور سوچنے لگا۔ پھر ان سے بولا:

"تم دیوار کی طرف مُنھ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

اُنھوں نے اس کے حُکم کی تعمیل کی اور دیوار کی طرف مُنھ کر کے کھڑے ہو گئے۔ ریاض نے انھیں ایک بار پھر تنبیہ کی کہ اگر اُنھوں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو گولی اُن کے سر کے پار ہو گی۔

"بلکہ اگر انھوں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو یہ دونوں پتّھر کے بن جائیں گے۔ کیوں کہ بقول ابّا جان ہم کالا علم جانتے ہیں۔"

انسپکٹر ریاض نے آفتاب کو اِشارہ کیا کہ وہ انھیں اسی طرح باتوں میں لگائے رکھّے۔ آفتاب کو اشارہ ملنے کی دیر تھی کہ اس کی زبان چل پڑی۔ "یوں تو ہمیں بنگال کا جادُو اور چین کا جادُو بھی آتا ہے، لیکن ہم فی الحال تم پر کالا علم ہی آزمائیں گے۔"

اس دوران میں سب انسپکٹر ریاض دبے پاؤں ان کی طرف بڑھتا رہا تھا۔ اس نے ریوالور کو نال کی طرف سے

پکڑ لیا تھا۔ دونوں کو اس کے قریب پہنچنے کا علم اس وقت ہوا، جب انسپکٹر عین اُن کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ وہ چونک کر مُڑے لیکن اتنی دیر میں ریوالور کا دستہ برق رفتاری سے اُن کی کن پٹیوں پر پڑ چکا تھا۔ دُوسرے ہی لمحے وہ دونوں کٹے ہوئے تنے کی مانند زمین پر آ رہے۔

"اب بتاؤ، ڈرائنگ رُوم میں کون کون ہے اور آصف کہاں ہے؟" منوّر علی خاں نے پُوچھا۔

"وہاں بھی اُن کے دو ساتھی موجُود ہیں۔ یہ لوگ یشودا کی لاش کو لے جانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ہمیں ایک عجیب سی چیز کے ذریعے بے ہوش کر دیا تھا۔ جب ہم ہوش میں آئے تو بندھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ دراصل وہ تیر اور شیشیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا، یہ آپ ڈرائنگ رُوم میں چل کر دیکھ لیں۔"

اُنھوں نے جلدی جلدی دونوں بے ہوش مجرموں کو باندھا اور دبے پاؤں ڈرائنگ رُوم کی طرف چل پڑے۔ سب سے آفتاب اور فرحت اندر داخل ہوئے۔

"چیزیں مل گئی ہیں اور ہم نے تمھارے ساتھیوں کے حوالے کر دی ہیں۔"

"اور وہ دونوں کہاں ہیں ؟" نمبر ایک نے چونک کر کہا۔
"ارے ! کیا وہ یہاں نہیں پہنچے ؟" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔
"بکو مت ۔ سچ سچ بتاؤ وہ کہاں ہیں ؟"
"وہ دیکھو، ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑے ہیں"۔ آفتاب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔
نمبر ایک اور اس کے ساتھی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں سب انسپکٹر ریاض ریوالور تانے کھڑا تھا، اس کے ساتھ منور علی خاں تھے اور پیچھے کانسٹیبل ۔ ان کی نظریں آصف پر پڑیں تو وہ بُری طرح چونکے اور کانپ کر رہ گئے ۔ اس کی ٹانگ سے خون ابھی تک بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ آلہ اس کی پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔
منور علی خاں کا جی چاہا کہ وہ سب انسپکٹر ریاض کے ہاتھوں سے ریوالور لے کر ان پر بے دریغ گولیاں چلا دیں مگر وہ کچھ نہ کر سکے وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا پسند نہیں کرتے تھے۔
انھوں نے یہاں بھی وہی گر استعمال کیا ۔ چند منٹوں کے بعد وہ دونوں بھی بندھے پڑے تھے ۔ کانسٹیبل آزاد

ہونے کے بعد اپنے ہاتھ پاؤں زور زور سے ہلا رہے تھے۔
آصف کو ایک پلنگ پر لٹا کر اس کی ٹانگ پر پٹی باندھ دی گئی ۔ آفتاب ڈاکٹر کو فون کرنے چلا گیا۔ دن نکل آیا تھا اور مصیبتوں بھری رات ٹل چکی تھی۔ دن کا سورج انھیں کن حادثات سے دوچار کرنے والا تھا اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔

ڈاکٹر نے آصف کا زخم دیکھا اور حیران رہ گیا ۔ اس کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔
"اُف خدا! میں نے اپنی زندگی میں اس قسم کا زخم نہیں دیکھا ۔ رگیں کٹ گئی ہیں۔ انھیں فوراً ہسپتال میں داخل کرا دینا چاہیے"۔ اس نے یہ کہہ کر پٹی باندھ دی۔
اسی وقت سرکاری ہسپتال کو فون کر کے ایمبولینس منگائی گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد آصف بھی اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں بستر پر لیٹا تھا، جس میں کامران مرزا موجود تھے۔
آفتاب ، فرحت اور منور علی خاں بھی وہیں آ گئے تھے۔ اور کامران مرزا کے گھر کے چاروں طرف پولیس لگا دی گئی تھی۔

دن نکلتے ہی اس واقعے کی خبر بڑے بڑے افسروں کو ہو گئی۔ افسروں کا تانتا بندھ گیا۔ کامران مرزا پریشان ہو گئے۔ ان کے لیے ہر ایک کو رات کے واقعات بتانا دشوار ہو گیا۔ لیکن بڑے افسروں سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے یہ ڈیوٹی مُنوّر علی خان کے ذمّے لگا دی۔ پھر جو بھی اُن سے ملنے آیا اور رات کے واقعات جاننے کا خواہش مند ہوا مُنوّر علی خاں نے اسے پوری تفصیل سے واقعات سُنائے۔ کامران مرزا آصف کے لیے بہت فکر مند تھے۔ اُنھوں نے اس کے متعلق سُن کر کہا تھا:

"اس کی جگہ آفتاب زخمی ہوتا تو مجھے اتنا فکر نہ ہوتا۔ وہ میرے دوست کا بیٹا ہے اور وہ بھی مُلک سے باہر گیا ہوا ہے۔ ان حالات میں اس کا زخمی ہونا مجھے کھل رہا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اس کے ساتھ یہ انسانیّت سوز سلوک کیا ہے یا جو لوگ اس کے ذمّے دار ہیں، میں انھیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ صحّت یاب ہونے کے بعد پہلا کام یہی کروں گا کہ انھیں چُن چُن کر صفحۂ ہستی سے مٹا دوں۔ میں جانتا ہوں، اس کے لیے مجھے ایک طویل اور خطرناک سفر اختیار کرنا پڑے گا، لیکن

کوئی پروا نہیں۔ یہ مسئلہ اگر صرف آصف کا ہوتا تو شاید میں اپنے سامنے موجود مجرموں کو سزا دلوا کر صبر کر لیتا، لیکن میں یشوما کے الفاظ نہیں بھول سکتا۔ اس کی موت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، سچ کہا تھا۔ اگر وہ سچّا نہ ہوتا تو ان پُراسرار حالات میں کبھی نہ مرتا۔"

اور پھر یہ کہانی سارے شہر میں گردش کرنے لگی۔ لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ کامران مرزا ہسپتال میں پڑے پڑے جھلاہٹ کا شکار ہو چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوراً ٹھیک ہو جائیں۔ دُوسری طرف آصف کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ کامران مرزا کو ٹھیک ہونے میں کم از کم پندرہ دن لگیں گے، البتّہ آصف ایک ہفتے میں ٹھیک ہو جائے گا۔

ایک شام ہسپتال میں ہل چل سی مچ گئی۔ معلوم ہوا کہ وزیرِ داخلہ کامران مرزا کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ کامران مرزا کو اپنے بستر سے اُٹھنا پڑا، لیکن اُنھوں نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"لیٹے رہیے، لیٹے رہیے۔ میں تو بس یوں ہی چلا آیا تھا۔"

"آپ نے ناحق تکلیف کی۔ میں تو بھلا چنگا ہوں۔"

"در اصل میں ایک اور خیال سے آیا ہوں۔" وزیر داخلہ صاحب بولے۔

"فرمائیے۔" کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"اگر آپ کچھ کمزوری محسوس کر رہے ہوں تو کیوں نہ اس مہم کے لیے انسپکٹر جمشید کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔"

"آپ اگر یہی مناسب سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں میں ان کی قابلیت کا اعتراف دل سے کرتا ہوں۔ لیکن یہ واقعات میرے گھر سے شروع ہوئے ہیں، اس لیے مناسب یہی رہے گا کہ میں ہی اس مہم کو سر کروں۔ اگر میں ناکام رہا تو میں خود ان کو دعوت دوں گا اور پھر ہم مل کر اس مہم کو سر کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ میری بات کو محسوس نہ کریں۔ میں نے صرف آپ کی حالت دیکھ کر یہ مشورہ دیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں، جناب۔ اب تو میں جلد ہی ٹھیک ہونے والا ہوں۔"

"اچھا، ایک بات اور ہے۔ مجرموں کے پاس سے برآمد

ہونے والی وہ چیزیں جو ابھی تک آپ کے گھر میں پوشیدہ ہیں، انھیں کیوں نہ وہاں سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے۔"

"وہ چیزیں آصف نے رکھی ہیں۔ اس کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ گھر ہی میں ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ ہر طرح محفوظ ہیں اور ان کے بارے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"لیکن مجرم بہت خطرناک ہیں۔ ان کے پاس ایسے ایسے ہتھیار ہیں جن کے بارے میں ہمارے سائنس دان ابھی صرف سوچ رہے ہیں۔ ان حالات میں ان چیزوں کا گھر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں، آپ اپنے آدمیوں کو بھیج کر وہ چیزیں تلاش کروا لیں۔ اگر وہ آپ کے آدمیوں کو مل جاتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر وہ ان چیزوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ انھیں وہیں رہنے دیا جائے، جہاں وہ ہیں۔"

"ارے بھئی، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ بھلا میرا عملہ ایک بچے کے ہاتھ کی رکھی ہوئی چیزوں کو تلاش نہیں

کر سکے گا؟ میں اسی وقت اپنے آدمی بھیج کر تلاش کرا لیتا ہوں۔ بلکہ میں اس وقت تک یہیں بیٹھوں گا جب تک کہ وہ مل نہ جائیں۔"

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔"

وزیرِ داخلہ نے فون پر خفیہ پولیس کے بڑے افسر کو ہدایات دیں اور ریسیور رکھ کر وہیں جم گئے۔ کمرے میں اس وقت آصف بھی موجود تھا۔ اسے ڈاکٹروں نے ہسپتال کے اندر چلنے پھرنے کی اجازت دے دی تھی اور وہ زیادہ تر کامران مرزا کے کمرے میں رہنے لگا تھا۔ آصف کے علاوہ وہاں آفتاب اور منور علی خاں بھی تھے۔ آفتاب اور آصف مسکرا رہے تھے۔

خفیہ پولیس کے دس آدمی کامران مرزا کے گھر کے سامنے پہنچے۔ مکان چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں تھا اور کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔

خفیہ پولیس کے دس کارکنوں کے پاس خصوصی اجازت نامے موجود تھے، اس لیے انھیں اندر جانے دیا گیا۔ ان آدمیوں کے لیڈر کا نام عباس خاں تھا۔ اس نے ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"میرا خیال ہے، یہ کام کچھ مشکل ثابت نہیں ہو گا۔ ہمیں اس گھر سے ایک تیر، جس کی لمبائی صرف ڈیڑھ انچ اور رنگ سُرخ ہے، برآمد کرنا ہے۔ اس کے علاوہ تین شیشیاں جن میں زرد رنگ کا کوئی سیال ہے اور تین نیلے رنگ کی کسی دھات کی ڈبیاں برآمد کرنی ہیں۔ ہم دن رات اسی قسم کے کام کرتے رہتے ہیں، لیکن اس بار جو حکم ملا ہے، وہ بہت عجیب ہے۔ وزیر صاحب نے حکم دیا ہے کہ اگر وہ چیزیں برآمد نہ ہوئیں تو انھیں شرمندگی اُٹھانا پڑے گی۔ یہ چیزیں کسی لڑکے نے اس گھر میں چھپائی ہیں۔ اس کے لیے کوئی باقاعدہ منصوبہ نہیں بنایا گیا، لہٰذا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ چند منٹ کے اندر اندر ہی مل جائیں گی۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھتا ہوں اور تم سارے مکان میں پھیل جاؤ، اور ایک ایک چیز چھان مارو۔ مگر خبردار! ہمیں یہ ہدایت بھی ملی ہے کہ گھر کی کسی چیز کو نقصان نہ پہنچے۔ مطلب یہ کہ صوفوں کو نہ چھاڑا جائے۔ اور بھی کوئی توڑ پھوڑ نہ کی جائے۔ بتایا گیا ہے کہ وہ چیزیں کسی ایسی کوشش کے بغیر ہی مل سکتی ہیں۔"

عباس خاں نے اچھی خاصی تقریر جھاڑ دی۔ پھر وہ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے نو ماتحت پورے

گھر میں پھیل گئے، اور ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لینے لگے۔ اُنھوں نے ہر الماری کا جائزہ لیا۔ بستر اُلٹ پلٹ کر دیکھے۔ میزیں اُلٹا اُلٹا کر دیکھیں۔ درازیں کھولیں۔ الماریوں اور میزوں میں خفیہ درازیں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ دیواروں کو ٹھوک بجا کر دیکھا۔ فرشوں کے قالین اُلٹ کر دیکھے کہ کہیں ان کے نیچے کوئی خفیہ خانہ ہو۔ غرض ہر طرح کوشش کر کے دیکھ لیا، لاکھ جتن کر ڈالے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ابھی تک انھیں ان چیزوں میں سے ایک بھی چیز نہ ملی تھی۔

اب تو وہ بہت فکر مند ہوئے۔ ذہنوں پر خوب زور دیا مگر کچھ نہ بنا۔ وہ چیزیں نہ ملنا تھیں نہ ملیں۔ آخر وہ سب ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔

"ہم نے الگ الگ رہ کر تو کوشش کر کے دیکھ لی۔ اب سب ایک ساتھ اس گھر کا جائزہ لیں گے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ اُنھوں نے نئے سرے سے چھان پھٹک شروع کی۔ یہاں تک کہ فضلو کے کمرے کو بھی نہ چھوڑا۔ وہ چلّاتا ہی رہ گیا کہ وہ چیزیں یہاں ہرگز نہیں ہیں۔ مگر اس پریشانی کے عالم میں اس کی کون سُنتا۔

اُنھوں نے سٹور اور کباڑ خانہ تک دیکھ ڈالا۔ آخر تھک ہار کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ان کے سر جُھکے ہوئے تھے۔

عبّاس خان نے اُنھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور بولا:

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ تمھارے سر جُھکے ہوئے ہیں۔ تو کیا تم ناکام لوٹے ہو؟ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہمیں افسوس ہے، جناب۔ ہم اپنی پُوری کوشش کر چکے ہیں۔"

"تم ایک دم نالائق ہو۔ میں ابھی ان چیزوں کو ڈھونڈے لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر عبّاس خاں غُصّے میں بھرا ہوا اُٹھا اور ڈرائنگ روم سے تلاش شروع کر دی۔ اس نے بھی وہ سب کچھ کیا جو اس کے آدمی کر چکے تھے۔ تمام چیزیں اِدھر اُدھر پلٹ ڈالیں۔ ریڈیو سیٹ اور ٹیلے وژن سیٹ کھول کر دیکھے۔ مگر وہ چیزیں اسے بھی کہیں نظر نہ آئیں۔ اب تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ وزیر صاحب کو کیا جواب دے؟ یہ کہ ایک لڑکے کے ہاتھ کی چھپائی ہوئی چیزوں کو دس آدمی مل کر تلاش نہیں کر سکے۔ آدمی بھی وہ جو اس کام کے ماہر ہیں۔ جو اس وقت تک بڑے بڑے مجرموں کی چھپائی ہوئی چیزوں کو تلاش کر چکے تھے۔

"اب کیا کیا جائے ؟" عباس خاں نے پریشان ہو کر کہا۔
"ہماری تو عقل حیران ہے۔ کہیں وہ لڑکا بے وقوف تو نہیں بنا رہا ؛ ہو سکتا ہے وہ چیزیں اس مکان میں موجود ہی نہ ہوں ؟"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حالات اور واقعات بتاتے ہیں کہ وہ چیزیں اس مکان کے اندر ہی ہیں۔"
"تب پھر ہم انھیں کہاں ڈھونڈھیں ؟ ہم نے کوئی چیز بھی تو نہیں چھوڑی۔"
"کیوں نہ ایک کوشش اور کر ڈالیں۔" عباس خان نے کہا۔
"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" ایک نے کہا۔
ایک بار پھر وہ مکان کی تلاشی لینے میں جُٹ گئے۔ اور پھر دس منٹ بعد سب ایک جگہ بیٹھے خوف زدہ انداز میں ہانپ رہے تھے۔ وہ بُری طرح ناکام ہو گئے تھے۔
"اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ ہم اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اگر جھڑکیاں کھانا ہمارا مقدر بن چکا ہے تو کھالیں گے۔" عباس خاں نے کہا اور فون کا ریسیور اُٹھا کر ہسپتال کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

ٹیلے فون کی گھنٹی کی آواز سُن کر وہ سب چونک اُٹھے۔ وزیر داخلہ پُرجوش انداز میں بولے "لیجیے۔ وہ چیزیں مل گئیں۔"
یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا۔ اُنھوں نے دیکھا، وزیر صاحب کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی جا رہی تھیں۔ آخر اُنھوں نے ریسیور رکھ دیا اور خاموشی سے انھیں گھورنے لگے۔
"کیا بات ہے، جناب ؛ خیریت تو ہے ؟ کیا آپ نے کوئی بُری خبر سُنی ہے ؟"
"انھیں وہ چیزیں نہیں ملیں۔ انھوں نے تین بار تلاشی لی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔"
"اوہ !" کامران مرزا مُسکرائے "میرا تو پہلے ہی یہ خیال تھا۔"
"حیرت ہے ! وہ لوگ یہ خیال بھی ظاہر کر رہے تھے کہ ہو سکتا ہے وہ چیزیں مکان میں موجود ہی نہ ہوں۔"
"اگر یہ بات ہوتی تو آصف مجھے پہلے ہی بتا دیتا۔" کامران مرزا بولے۔
"کمال ہے۔ آخر انھوں نے وہ کہاں چھپائی ہیں ؟"
"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، اور جب تک میں ٹھیک ہو کر گھر نہیں چلا جاتا اس وقت تک معلوم کرنا چاہتا بھی نہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان چیزوں کے متعلق صرف آصف کو معلوم ہے۔"

"جی نہیں۔ میرا خیال ہے، فرحت بھی جانتی ہے۔" آفتاب نے کہا "کیوں کہ جب چیزیں چھپائی گئی تھیں تو فرحت بھی آصف کے ساتھ تھی۔"

"نہیں۔ میں نے فرحت کو بھی ایک جگہ کھڑا کر دیا تھا۔ وہ بھی اس جگہ سے بے خبر ہے، جہاں چیزیں پوشیدہ ہیں۔"

"اس صورت میں آصف کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس کی حفاظت کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ بلکہ آپ سب کی۔ گھر کے گرد تو پہرا ہے۔ میں ہسپتال کے اردگرد بھی پہرا بٹھائے دیتا ہوں" وزیر صاحب نے کہا۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں، کریں۔" کامران مرزا بولے "میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"نہیں۔ یہ ضروری ہے۔ اور ہاں، جس روز آپ صحت یاب ہو کر گھر جائیں، مجھے ضرور اطلاع دے دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آصف میری موجودگی میں وہ چیزیں پوشیدہ جگہ سے نکالے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مقابلے کی تجویز

اس رات کے بعد ابھی تک کوئی اور حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ کامران مرزا اور آصف کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ شام کے وقت آفتاب فرحت اور منور علی خاں گھر آ جاتے۔ اس غرض کے لیے انھیں سرکاری جیپ دے دی گئی تھی۔ جیپ کے ساتھ کچھ کانسٹیبل بھی ہوتے۔

سب انسپکٹر ریاض کے ہاتھوں جو چار مجرم گرفتار ہوئے تھے وہ ابھی تک حوالات میں تھے۔ اُن سے ہر طرح پوچھ گچھ ہو چکی تھی مگر انھوں نے زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکالا تھا۔ دن کی روشنی میں اُن کے انگوٹھوں کا جائزہ لیا گیا تو وہاں کوئی چھلا نظر نہ آیا۔ ان کی زبان کھلوانے کے لیے اُن پر کئی گُر آزمائے گئے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ صرف ایک ہی بات کہتے رہے:

"اِدھر ہم نے زبان کھولی، اُدھر ہماری موت نے ہمیں آ دبوچا۔"

پولیس نے انھیں ہر طرح اطمینان دلایا کہ ان تک کوئی نہیں پہنچ سکتا لیکن وہ کسی طرح نہ مانتے۔ ایک خاص بات جو دیکھی گئی، وہ یہ تھی کہ چاروں بے حد سہمے ہوئے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس سے ڈر رہے ہیں تو انھوں نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ آخر پولیس نے تھک کر ہتھیار ڈال دیے اور کامران مرزا کو بھی یہ اطلاع دے دی گئی۔ انھوں نے یہ سن کر کہا:

"میں صحت یاب ہونے کے بعد ان لوگوں سے بات کروں گا اور ضرور کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

ایک شام وہ ہسپتال کے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"میں ایک بہت بڑے خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔" یک آفتاب بول اٹھا۔

"سونگھتے رہو۔ ہم تمھیں اس سے باز تھوڑا ہی رکھ سکتے ہیں۔" فرحت نے شانے اچکائے۔

آصف نے چونک کر کہا "کیا مطلب! اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوربا ہمیں کسی بہت بڑے اور خوف ناک خطرے کے بارے میں بتانے والا تھا۔ اتنا بڑا

خطرہ کہ شاید ہم اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں۔" آفتاب کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"میں بھی انھی لائنوں پر سوچ رہا ہوں۔ مجھے آفتاب کے خیال سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ہم ہر لمحے خطرے کی زد میں آتے جا رہے ہیں۔"

"کیا صرف ہم؟" منور علی خاں نے سوال کیا۔

"ہاں، ہم بھی اور ہمارے ساتھ ساتھ ملک بھی۔"

"مگر حالات تو بالکل پُرسکون ہیں۔"

"یہ سکون ہی تو مجھے بہت بڑے طوفان کا پتا دے رہا ہے۔ آصف، کہیں ایسا تو نہیں ۔۔۔۔ کہ ۔۔۔" کامران مرزا کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"کہیے انکل، آپ رک کیوں گئے؟" آصف نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ لوگ تمھاری چھپائی ہوئی چیزیں حاصل کر چکے ہوں اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ مجھے تو ان کے خاموش بیٹھ جانے کی یہی وجہ نظر آتی ہے۔"

"لیکن گھر کے گرد تو اسی وقت سے پہرا موجود ہے جب ان چاروں کو گرفتار کیا گیا تھا۔"

"تم ابھی تک ان لوگوں کو نہیں سمجھے۔ ان کو پولیس کے

پولیس نے انھیں ہر طرح اطمینان دلایا کہ ان تک کوئی نہیں پہنچ سکتا لیکن وہ کسی طرح نہ مانے۔ ایک خاص بات جو دیکھی گئی، وہ یہ تھی کہ چاروں بے حد سہمے ہوئے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس سے ڈر رہے ہیں تو انھوں نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ آخر پولیس نے تھک کر ہتھیار ڈال دیے اور کامران مرزا کو بھی یہ اطلاع دے دی گئی۔ انھوں نے یہ سن کر کہا:

"میں صحت یاب ہونے کے بعد ان لوگوں سے بات کروں گا اور ضرور کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

ایک شام وہ ہسپتال کے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"میں ایک بہت بڑے خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔" یک لخت آفتاب بول اٹھا۔

"سونگھتے رہو۔ ہم تمھیں اس سے باز تھوڑا ہی رکھ سکتے ہیں۔" فرحت نے شانے آچکائے۔

آصف نے چونک کر کہا "کیا مطلب! اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً ہمیں کسی بہت بڑے اور خوف ناک خطرے کے بارے میں بتانے والا تھا۔ اتنا بڑا

خطرہ کہ شاید ہم اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں۔" آفتاب کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"میں بھی انھی لائنوں پر سوچ رہا ہوں۔ مجھے آفتاب کے خیال سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ہم ہر لمحے خطرے کی زد میں آتے جا رہے ہیں۔"

"کیا صرف ہم؟" منور علی خاں نے سوال کیا۔

"ہاں، ہم بھی اور [redacted] کے ساتھ ساتھ ملک بھی۔"

"مگر حالات تو بالکل پُر سکون ہیں۔"

"یہ سکون ہی تو مجھے بہت بڑے طوفان کا پتا دے رہا ہے۔ آصف، کہیں ایسا تو نہیں .... کہ ...." کامران مرزا کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"کہیے نکل، آپ رک کیوں گئے؟" آصف نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ لوگ تمھاری چھپائی ہوئی چیزیں حاصل کر چکے ہوں اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ مجھے تو ان کے خاموش بیٹھ جانے کی یہی وجہ نظر آتی ہے۔"

"لیکن گھر کے گرد تو اسی وقت سے پہرا موجود ہے جب ان چاروں کو گرفتار کیا گیا تھا۔"

"تم ابھی تک ان لوگوں کو نہیں سمجھے۔ ان کو پولیس کے

گھیرے نہیں روک سکتے۔ یہ اگر ایک گیس پستول سے فائر کر دیں تو سامنے پورا دستہ بھی کھڑا ہو تو وہ بھی اُلٹ جائے۔"

"لیکن انکل، ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔" آصف نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر یہ نہ بھولو کہ وہ پولیس کے آدمیوں سے بھڑے بغیر بھی مکان میں داخل ہو سکتے ہیں۔"

"فرض کیجیے ایسا ہو بھی جائے تب بھی میری چھپائی ہوئی چیزیں انھیں نہیں ملیں گی۔ کیا خفیہ پولیس کے آدمی اپنی سی کر کے نہیں دیکھ چکے؟"

"میں مانتا ہوں۔ پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرا خیال درست ہی نہ ہو۔"

"تب پھر کیا کیا جائے؟"

"صحت یاب ہونے سے پہلے ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ تم کل ہسپتال سے فارغ ہو رہے ہو۔ گھر پہنچ کر اس جگہ کا معاینہ ضرور کر لینا اور مجھے فون پر بتا دینا۔"

"بہت اچھا۔ میں یہی کروں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔"

"ابا جان، اگر وہ چیزیں ابھی تک وہیں ہیں تو پھر ان لوگوں کے خاموش بیٹھ جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" آفتاب نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"یہی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو وہ لوگ کوئی بہت بڑا منصوبہ ہمارے خلاف بنا رہے ہیں، یا پھر جو کوئی بھی اُن سے کام لے رہا ہے، اس نے انھیں ہمارے خلاف کوئی قدم اُٹھانے سے روک رکھا ہے۔"

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں؟ کیا ان چیزوں کی اب ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رہی جو ہمارے قبضے میں آ چکی ہیں۔"

"اگر اہمیت نہ ہوتی تو وہ ان کو واپس حاصل کرنے کا خطرہ مول نہ لیتے۔"

"پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" کامران مرزا نے کہا اور کسی سوچ میں کھو گئے۔

اچانک آفتاب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے منھ سے یہ الفاظ نکل گئے:

"اوہ! اُف! میرے خدا! ان کو تو ہم بھول ہی گئے!"

"ارے! یہ بیٹھے بٹھائے تمھیں کیا ہو گیا؟" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے، اسے کوئی خاص بات یاد آ گئی ہے۔" آصف مسکرایا۔

"یہ حضرت بعض اوقات عام بات یاد آنے پر بھی اسی طرح چونک پڑتے ہیں۔" فرحت بولی۔

"جبھی پہلے اس سے پوچھ تو لو کہ ہم کن کو بھول گئے ہیں۔ تم دونوں تو اس کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔"

"کیا کریں، انکل۔ ہمیں مشکل سے ہی اس کے پیچھے پڑنے کا موقع ملتا ہے، جب کہ یہ ہر وقت ہمارے پیچھے پڑا رہتا ہے۔"

آفتاب ابھی تک گنگ بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی تھی۔

"ارے! یہ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ لگتا ہے۔" آصف بولا۔

"ہاں۔ معاملہ کچھ زیادہ ہی اہم معلوم ہوتا ہے۔ چلو، اس سے پوچھیں۔" فرحت نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"تو اس میں کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ صاحب تو یہیں موجود ہیں۔" آصف نے کہا۔

"اچھا۔ میں تو سمجھی تھی کہ کہیں پہنچے ہوئے ہیں۔" فرحت مسکرائی۔

"پہنچے ہوئے تو اللہ والے لوگ ہوتے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"پہنچا ہوا ہونا کئی موقعوں پر بولا جاتا ہے۔"

"بولا جاتا ہوگا۔" آصف نے منہ بنا کر کہا "ہاں آفتاب تم بتاؤ، تمھیں کیا بات یاد آئی؟"

"پہلے تم بول بول کر اپنا جی خوش کر لو۔" آفتاب نے جل بھن کر کہا۔

"جلنے اور بھننے کی کیا ضرورت ہے؟" فرحت ہنسی۔

"میرا خیال ہے، تمھارا جھگڑا آج شاید ہی ختم ہو۔ اس لیے کیوں نہ پہلے آفتاب سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ وہ کیا بات ہے جو اسے یاد آئی ہے اور جسے ہم سب بھولے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ کوئی بہت اہم بات ہو اور اس کا فوری طور پر علم میں آنا ضروری ہو۔" کامران مرزا نے کہا۔

"تجویز معقول ہے بشرطے کہ ان تینوں کو بھی پسند آ جائے۔" منوّر علی خاں نے جلدی سے کہا۔

"اگر آپ لوگوں کی یہی رائے ہے تو میں چپ ہوا جاتا ہوں۔" آصف نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"آصف کے خاموش ہونے کے بعد میرے بولتے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے میں بھی خاموش ہوں۔" فرحت نے کہا۔

"اب رہ گیا میں۔ تو مجھے تو وہ بات بتانے کے لیے بولنا ہی پڑے گا۔ ہونٹوں کو حرکت دینی ہی ہو گی۔ اِس لیے مجبور ہوں۔ بولے بغیر چارہ نہیں۔"

"اب یہ خود دیر کر رہا ہے۔" آصف بیچ میں بول پڑا۔

"پھر بولے تم!" فرحت بھی نہ رہ سکی۔

"بس ہو چکے یہ خاموش۔" منوّر علی نے مایوس ہو کر کہا۔

"انھیں بولتے رہنے دیں اُنکل۔ میں آپ لوگوں کو اس حالت میں بھی بتا سکتا ہوں۔"

"ارے، تو بتاؤ بھی نا!" کامران مرزا جھنجھلا اُٹھے۔

"ابّا جان، ننھّا تیر، شیشیاں اور ڈبیاں تو خیر آصف نے چھپا رکھی ہیں لیکن وہ تین گیس پستول کہاں ہیں جو آپ نے نمبر نو، دس اور گیارہ سے حاصل کیے تھے؟ ان کا کیا بنا اور مجرموں کو وہ پستول حاصل کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ انھیں خیال نہیں آیا؟ در اصل وہ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ سب چیزیں ایک ہی جگہ پر پوشیدہ ہوں گی، اس لیے اُنھوں نے پستولوں کا ذکر نہیں کیا ہو گا یا پھر ان کی نظروں میں پستولوں کی

کوئی اہمیت نہیں ہو گی۔ جیسا کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ گیس پستول ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔" کامران مرزا بولے۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک پستول تو کوئی اہمیت نہیں رکھتے، البتہ وہ تیر اور شیشیاں ضرور اہم ہیں۔" آفتاب بولا۔

"ہاں۔ تمھارا خیال ٹھیک ہے۔"

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے ...۔" آفتاب نے کہنا شروع کیا تھا کہ فرحت بول اُٹھی:

"مجھے تو کہیں کوئی سوال پیدا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔"

"تمھاری نظر کمزور ہے۔" آفتاب نے تلملا کر کہا۔ پھر بولا "میں کہہ رہا تھا کہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پستول کہاں ہیں؟"

"وہ ... وہ میں نے گھر میں ایک جگہ اس وقت چھپا دیے تھے جب میں سیکرٹری صاحب کو بلانے کے لیے گیا تھا۔"

"اوہ! اس کا مطلب یہ ہوا کہ خفیہ پولیس کے آدمی ان پستولوں کو بھی برآمد نہیں کر سکے۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تم تینوں کی نسبت چیزیں چھپانے میں کم ماہر ہوں؟" کامران مرزا نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی .... جی نہیں ۔ یہ تو ہم قیامت تک نہیں سمجھ سکتے۔"

"بس تو پھر، وہ پستول ایسی جگہ پر ہیں جہاں ان لوگوں کا خیال تک نہیں جا سکتا، اور نہ تمھارا ۔ میں تم لوگوں کو مقابلے کی دعوت دیتا ہوں ۔ تم تینوں مل کر ان پستولوں کو تلاش نہیں کر سکو گے۔"

"تو... تو کیا آپ آصف کی چھپائی ہوئی چیزوں کو تلاش کر سکیں گے؟"

"مجھے اُمید ہے کہ میں انھیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"تب پھر یہ مقابلہ ضرور ہو گا۔" آفتاب نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں ۔ ضرور ہو گا۔" فرحت اور آصف نے ایک ساتھ کہا۔

منوّر علی خاں اور کامران مرزا مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ رات کافی بیت گئی تھی، اس لیے کامران مرزا نے کہا:

"اب تم لوگ گھر جا کر آرام کرو۔ اور خبردار! اسی وقت سے پستولوں کی تلاش شروع نہ کر دینا۔ مجرم ضرور ہماری تاک میں ہیں ۔ لیکن شاید اب وہ ہمارے سامنے نہیں آنا چاہتے ۔ نظروں سے اوجھل رہ کر اپنا کام کرنا چاہتے ہیں اور یہ صورتِ حال پہلے کی نسبت زیادہ خطرناک ہے ۔ اس

لیے جب تک میں گھر نہیں پہنچ جاتا، یہ مقابلہ شروع نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے، ابّا جان ۔ ہم اس پر عمل کریں گے۔"

"اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ مقابلہ وزیرِ داخلہ اور خفیہ پولیس کے وہ دس آدمی بھی دیکھیں گے، جو تلاش میں ناکام ہو چکے ہیں۔"

"ہاں۔" کامران مرزا نے جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ تھکن محسوس کر رہے تھے۔

چاروں اُٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کر کے ہسپتال سے نکل آئے ۔ باہر جیپ کھڑی تھی ۔ اس میں چار کانسٹبل بھی تھے ۔ وہ خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گئے ۔

جوں ہی جیپ ہسپتال سے نکل کر سڑک پر مڑی، آفتاب چونک اُٹھا ۔ اس نے گھبرا کر آصف، فرحت اور منوّر علی خان کی طرف دیکھا، مگر وہ بے خبر سامنے دیکھ رہے تھے۔ انھیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آفتاب کسی بات پر چونکا تھا۔

سیاہ رنگ کی کار

"آصف، کیا تم نے کچھ محسوس کیا؟" اچانک آفتاب نے پوچھا۔

"کیا محسوس کیا؟ پہیلیاں نہ بجھوایا کرو۔"

"فرحت، تم نے تو ضرور محسوس کیا ہوگا۔" آفتاب فرحت کی طرف مڑا۔

"کیا تم پر محسوس کرنے اور کرانے کا دورہ پڑ گیا ہے؟" فرحت نے برا سا منھ بنا کر کہا۔

"تو تم نے ابھی تک محسوس نہیں کیا۔" آفتاب مسکرایا۔

"حد ہو گئی۔ آخر تمھارا اشارہ کس طرف ہے؟" آصف نے جھلا کر کہا۔

"انکل، آپ کیا کہتے ہیں؟ میرا خیال ہے، آپ نے تو ضرور محسوس کیا ہوگا۔"

منور علی خاں کی ہنسی نکل گئی۔ وہ سمجھے، آفتاب مذاق کے موڈ میں ہے۔ اس کی طرف منھ کر کے بولے:

"مجھے کیوں لپیٹتے ہو؟ اپنا مذاق ان لوگوں تک ہی

محدود رکھو۔"

"ہائیں! تو کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں، میں مذاق کر رہا ہوں؟" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"تو کیا تم مذاق نہیں کر رہے ہو؟" منور علی بھی اسی کے لہجے میں بولے۔

"ہرگز نہیں، انکل۔ میں تو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔"

"آخر کیا محسوس کر رہے ہو تم؟ کیوں ہمارا دماغ خراب کرنے پر تل گئے ہو؟" آصف نے چلا کر کہا۔

"مجھے تمھارا دماغ خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہمارا دماغ تو پہلے ہی خراب ہے؟" فرحت نے اسے گھورا۔

"میں نے تو یہ نہیں کہا۔ تم اپنے جی میں جو جی چاہے، سمجھ سکتے ہو۔"

"حد ہو گئی! اب ہمارے دماغ خراب ہو گئے ہیں!" آصف غرّایا۔

"ان حضرت کے ساتھ رہ کر اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔" فرحت نے برا سا منھ بنایا۔

"اچھا اچھا۔ زیادہ بگڑو نہیں۔ جب میں تمھیں بتاؤں گا

کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں تو تمھاری سٹی گم ہو جائے گی۔"

"لیکن تم ہمیں بتاؤ گے کب؟ قیامت کو؟"

"نہیں۔ گھر پہنچنے سے پہلے بتاؤں گا۔ ڈرائیور صاحب، ذرا گاڑی کی رفتار تیز کر دو۔" جیپ کی رفتار تیز ہو گئی۔

"رفتار تیز کرانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" منور علی خاں نے پوچھا۔

"ذرا ٹھہر جائیں۔ پھر بتاؤں گا۔" آفتاب نے جواب دیا۔

کچھ دیر جیپ اسی رفتار سے دوڑتی رہی۔ پھر آفتاب نے ایک دم کہا: "رفتار آہستہ کر دو۔"

"یہ جیپ کے ساتھ کیا آنکھ مچولی ہو رہی ہے؟" آصف نے تنگ آ کر کہا۔

"تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ابھی بچے ہو۔" آفتاب مسکرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار پیدا ہو گئے۔ انھوں نے حیرت زدہ انداز میں اسے دیکھا۔ آخر آصف سے رہا نہ گیا۔ پوچھ ہی بیٹھا:

"آخر بات کیا ہے؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ؟"

"ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح چونکے۔ کانٹینبل بھی گھبرا گئے۔

"ہاں۔ ہسپتال سے ہی ایک سیاہ رنگ کی کار ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔"

"کیا!!!" ان کے منھ سے نکلا۔ ساتھ ہی انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک سیاہ کار سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

"میں نے اس کار کو کل بھی اپنے تعاقب میں دیکھا تھا لیکن اس وقت اسے ایک اتفاق سمجھا تھا۔ آج پھر دیکھا تو چونک اٹھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے جیپ کی رفتار تیز کرائی تھی۔ جوں ہی ہماری گاڑی کی رفتار تیز ہوئی، سیاہ کار کی رفتار بھی اسی قدر تیز ہو گئی اور جب جیپ کی رفتار سست ہوئی تو اس کی رفتار بھی سست ہو گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کار میں جو کوئی بھی ہے، ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ لیکن کیوں؟ آصف، اس سوال کا جواب تم دو۔" آفتاب یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"یہ لوگ اگر پچھلے کئی دنوں سے ہمارا تعاقب کر رہے ہیں تو اس کا مطلب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ ان کا خیال ہے کہ ہم نے ان سے حاصل کی ہوئی چیزیں کسی اور جگہ چھپائی ہیں۔ یہ ہمارا تعاقب کر کے اس

جگہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ کسی نہ کسی دن تو ہم ان چیزوں کو اس مقام سے ضرور نکالنے جائیں گے۔" آصف نے بتایا۔

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے ابھی تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔"

"ہوں! اب ہم کیا کریں؟" منور علی خاں نے پوچھا۔

"ہم سیدھے گھر جائیں گے۔ پھر دیکھیں گے کہ سیاہ کار واپس مڑتی ہے یا آگے جاتی ہے۔ اس کے بعد ابّا جان کو فون کر کے حالات سے باخبر کر دیں گے، اور جو ہدایات وہ دیں گے، اس پر عمل کریں گے۔ بہرحال یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ہم ایک خطرے میں گھر چکے ہیں۔" آفتاب نے کہا۔

"معاملات اُلجھتے ہی جا رہے ہیں۔" منور علی خاں سوچ میں گم تھے۔

"اور انکل کے صحت یاب ہوتے ہی ان میں اور تیزی آ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ وہ اٹھے ہوئے قدم کسی صورت بھی پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔ اگر معاملہ اُن کی ذات تک محدود ہوتا تو شاید وہ باز بھی آجاتے، لیکن بات مُلک کی سلامتی کی آ پڑی ہے۔ وہ کسی طرح بھی نہیں رُکیں گے۔

دُوسری طرف مجرم اپنی وہ چیزیں حاصل کرنے کے لیے پُورا زور صرف کر دیں گے۔ کیوں کہ جہاں تک میرا خیال ہے، بیشوما ہمیں بہت کچھ بتانے والا تھا۔ اب کہ ان لوگوں نے اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے، انکل ان چیزوں کی مدد سے ہی آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نکالیں گے۔" آصف نے کہا۔

"تمھارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ ابھی تک ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ان شیشیوں میں جو سیّال ہے، وہ کیا بلا ہے اور سُنہری مائل نیلی ڈبیوں میں کیا چیز ہے، مجرم گیس کے پستولوں سے کیوں کر محفوظ رہتے ہیں، وہ چھوٹا سا تیر اس قدر مہلک کس طرح بنایا گیا ہے، اور سُرخ موت کیا بلا ہے؟ ان سب باتوں کے جوابات ہمیں معلوم نہیں۔ اور اس وقت تک شاید ابّا جان کو بھی معلوم نہیں۔ پہلے وہ یہی جوابات معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن کیسے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔" آفتاب نے کہا اور خلا میں تکنے لگا۔

"یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ سیاہ کار والوں کے کیا اِرادے ہیں۔"

"گھر پہنچنے تک معلوم ہو جائے گا۔"

جیپ کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سیاہ کار بھی آہستہ ہو گئی۔ جیپ ان کی گلی میں مڑ گئی۔

اُنھوں نے مُڑ کر دیکھا، سیاہ کار دوڑتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔

جیپ سے اُتر کر وہ گھر میں داخل ہوئے۔ آفتاب کچھ کہے بغیر چھت پر جا چڑھا۔ دُوسرے لوگ اسے حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ فوراً ہی اُنھوں نے اسے واپس آتے دیکھا۔ اس کا چہرہ بُتا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟ تم چھت پر کیا کرنے گئے تھے؟" آصف نے پُوچھا۔

"میں سیاہ کار کو دیکھنے گیا تھا۔ چھت سے سڑک صاف نظر آتی ہے نا؟"

"پھر؟ تم نے کیا دیکھا؟"

"سیاہ کار سڑک کے کنارے موجُود ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"اوہ!!" اُن کے مُنھ سے نکلا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔ ہم کہیں بھی جائیں، وہ ہمارا پیچھا کریں گے۔" مُنوّر علی خاں بولے۔

"ہمیں ابّا جان کو فوراً اِطلاع کرنی چاہیے۔" آفتاب نے کہا اور ٹیلے فون والے کمرے کی طرف چل پڑا۔ سب اس کے ساتھ ہو لیے۔

"کیوں نہ ان لوگوں کو گرفتار کرا دیں؟" فرحت نے تجویز پیش کی۔

"اگر ابّا جان نے اِجازت دے دی تو یہی کریں گے۔" آفتاب نے کہا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ سلسلہ فوراً ہی مل گیا۔ اس نے ساری بات فون پر بتا دی اور دُوسری طرف کی بات سُننے لگا۔ اس کے بعد ریسیور رکھ کر اس نے عجیب سی نظروں سے ان سب کو دیکھا۔ پھر بولا:

"ابّا جان کہتے ہیں، ان لوگوں کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے آدمی اُن کا تعاقب کر رہے ہیں۔"

"شاید اُنکل ان کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔" فرحت نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔ یہی بات ہے۔"

"چلو بھئی، اب آرام کریں۔ مکان کے گرد پہرا ہے ہی۔ ہمیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" مُنوّر علی خاں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" سب ایک ساتھ بولے۔

مُنوّر علی خاں اپنے کمرے میں چلے گئے اور فرحت اپنے کمرے میں۔ آصف اور آفتاب ایک ہی کمرے میں سوتے تھے، اس لیے وہ اپنے کمرے میں چلے آئے۔ یہ وہی کمرا

تھا جس کی کھڑکی پائیں باغ میں کھلتی تھی اور جس میں یشوما آکودا تھا۔

انھیں یشوما کیا یاد آیا، آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ دونوں چپ چاپ اپنے اپنے بستر پہ لیٹ گئے۔ پھر ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کافی دیر بعد آصف نے آنکھیں کھول کر دیکھا، آفتاب گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک نگاہ آفتاب پر ڈالی اور پھر مطمئن ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ دبے پاؤں ایک کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آخر وہ اُس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور دروازے کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کافی دیر تک اِنتظار کرنے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا تو وہ دیوار سے ہٹ کر کمرے کے ایک گوشے کی طرف بڑھا۔ اس نے دیوار میں لگا ہوا سوئچ دبایا۔ کمرا جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ پھر اس نے کسی چیز کو کھول کر دیکھا اور پھر اسے بند کر کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن جوں ہی وہ دروازے کی طرف مُڑا، اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دروازے میں آفتاب کھڑا مُسکرا رہا تھا۔

پُراَسرار پیغام

"اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے ہو تم؟" آفتاب مُسکرایا۔

"دھت تیرے کی۔ میں تو تمھیں سوتا چھوڑ کر آیا تھا۔"

"میں پہلے ہی جانتا تھا کہ ابّا جان نے جو خیال ظاہر کیا تھا، تم اُس کی تصدیق ضرور کرو گے۔ اس لیے میں آنکھیں کر کے لیٹا رہا۔ تم یہاں وہ چیزیں دیکھنے آئے تھے کہ موجود ہیں یا نہیں اور چاہتے تھے کہ کسی دُوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ لیکن افسوس! تمھاری چالاکی دھری کی دھری رہ گئی۔ اب اس راز میں میں بھی شریک ہو گیا ہوں۔"

"تم ضرورت سے زیادہ چالاک ہو۔" آصف نے مُنھ بنا کر کہا۔

"ضرورت سے زیادہ تو نہیں۔ ضرورت کے مطابق کہہ سکتے ہو۔ آؤ، اس کمرے سے نکل چلیں۔ کہیں کسی کو معلوم نہ ہو جائے۔"

"ہاں، ٹھیک ہے۔ یہ بھی شکر ہے کہ فرحت یہاں نہیں

پہنچی۔"

دونوں مُڑے اور پھر ٹھٹک کر رک گئے۔ فرحت برآمدے میں کھڑی انھیں گھور رہی تھی۔

"میں تمھاری باتیں سُن چکی ہوں، اور یہ بھی جان چکی ہوں کہ تم نے وہ چیزیں کہاں چھپائی ہیں۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" آصف نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا بُرا ہوا؟" فرحت نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ تمھیں بھی معلوم ہو گیا۔ اب اگر خدا نا خواستہ مجرم کسی طرح اندر گھسنے میں کامیاب ہو جائیں اور ہمیں پکڑ کر زیرِ دستی معلوم کرنے کی کوشش کریں تو تم فوراً انھیں بتا دو گی۔"

"میں اتنی بے وقوف نہیں۔" فرحت نے جھلّا کر کہا۔

"بات بے وقوفی کی نہیں۔ کمزوری کی ہے۔ تم ٹھہریں کم زور سی لڑکی۔ اگر انھوں نے سختی کی تو سہہ نہ سکو گی۔ کیا تم بھول گئیں کہ ان لوگوں کے پاس تین تارا جیسی چیزیں ہیں۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے لیکن میں اتنی کمزور نہیں ہوں جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ اگر کبھی ایسا وقت آیا تو میری زبان سے کوئی لفظ نہیں سُنو گے۔ وہ سختی کرتے کرتے

مر جائیں گے، میری رُوح جسم سے نکل جائے گی، مگر زبان خاموش رہے گی۔"

"کہنا آسان ہے۔ جب ظُلم توڑا جاتا ہے، اس وقت برداشت کرنا کسی کسی کا کام ہے۔" آصف نے کہا۔

"خیر.... دیکھا جائے گا۔" فرحت نے کہا۔

"کچھ اس مُقابلے کے بارے میں بھی سوچا، جو ہونے والا ہے۔" آصف نے پُوچھا۔

"ہمارے اور ابّا جان کے درمیان؟" آفتاب نے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہمیں ابھی سے ذہن پر زور دینا چاہیے کہ انھوں نے پستول کہاں چھپائے ہوں گے۔" آصف بولا۔

"ہم ذہنوں پر زور تو دے سکتے ہیں لیکن انھیں تلاش نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ انکل منع کر چکے ہیں۔" فرحت نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن سوچ لینے میں کیا حرج ہے۔ آخر ہم گھر میں چلتے پھرتے یہ تو سوچ ہی سکتے ہیں کہ پستول فُلاں جگہ چھپائے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے انھوں نے اس سے تو منع نہیں کیا تھا۔" آصف نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ خیالی گھوڑے دوڑانے میں کوئی حرج نہیں۔ کیا خیال ہے، اسی وقت سے دوڑانے شروع کر دیں؟" فرحت

نے مُسکرا کر کہا۔

"نہیں۔ اس وقت نہیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُن کر اُنکل جاگ جائیں گے اور باہر جو لوگ پہرا دے رہے ہیں وہ بھی گھبرا جائیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مکان کو آسیب زدہ سمجھ لیں اور بھاگ کھڑے ہوں۔ اس کا نتیجہ کتنا خوف ناک ہو سکتا ہے، یہ تم جانتے ہی ہو۔ سڑک پر سیاہ کار میں مُجرم موجُود ہیں۔ جُوں ہی وہ پولیس کو بھاگتے ہوئے دیکھیں گے، ہم پر چڑھ دوڑیں گے اور پھر آئے گی ہماری شامت۔ شامت بھی ایسی کہ رات کو سُورج نظر آجائے گا۔" آفتاب بولتا چلا گیا۔

"رات کو سُورج؟ یہ کیا کہا تم نے؟" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"دن کو تارے نظر آسکتے ہیں تو کیا رات کو سُورج نظر نہیں آسکتا؟" آفتاب نے جواب دیا۔

"بالکل آسکتا ہے، لیکن صرف تمھیں۔ کیوں کہ یہ خیال سب سے پہلے تمھیں سُوجھا ہے۔ آصف نے سر ہلا کر تائید کی۔

"چلو مجھے ہی سہی، لیکن میں رات کو سورج دیکھنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ کیا خبر سورج رات کے وقت کس مُوڈ میں ہو؟"

"چل پڑی پھر زبان۔" آصف نے بُرا سا مُنھ بنایا۔

"اس بے چاری کا کام ہی چلنا ہے۔ کیا کرے۔" آفتاب نے کہا۔

"تم تو ہمارا دماغ پل پلا کر دو گے۔" فرحت نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھُونستے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ جب تک اُنکل نہیں آجاتے، ہم مکان کا اس خیال سے جائزہ ضرور لیتے رہیں گے کہ اُنھوں نے پستول کہاں چھُپائے ہوں گے۔ اور پھر جس دن یہ حیرت انگیز مُقابلہ ہوگا، اس دن ہم سب کو حیران کر دیں گے۔" آصف نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لوگ ہمیں ہی دیکھ کر حیران ہو جائیں۔ اگر ہم پستول تلاش نہ کر سکے تو کیا ہوگا؟ یہ سوچ لو۔ آخر ہم نے سب کچھ ابّا جان سے ہی سیکھا ہے۔" آفتاب نے کام کی بات کہی۔

"بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب ہم اس پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔ ویسے تم دونوں کا اس جگہ کے متعلق کیا خیال ہے، جہاں میں نے چیزیں رکھی ہیں؟"

"بہت اچھّی جگہ ہے۔" فرحت نے تعریف کی۔

"کیا خیال ہے، اُنکل آسانی سے اس جگہ تک پہنچ تو

نہیں پائیں گے ؟" آصف نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ان کے تلاش کرنے کا انداز ذرا مختلف ہے۔ وہ ہاتھوں کی نسبت عقل سے زیادہ تلاش کرتے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"ہوں۔ خیر، دیکھا جائے گا۔ اس دن رہے گا لطف۔" فرحت کا چہرہ سرخ تھا۔

"کیا خیال ہے، میں چھت پر چڑھ کر سیاہ کار کو دیکھ آؤں؟" آصف بولا۔

"ارے ہاں۔ اسے تو ہم بھول ہی گئے۔ آؤ، تینوں ہی چلتے ہیں۔"

وہ چھت پر پہنچے اور منڈیر پر کھڑے ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔

سیاہ کار اسی جگہ کھڑی تھی۔ ایک آدمی اس کے پاس ٹہل رہا تھا۔ اس کا لباس بھی سیاہ تھا۔ رات کے وقت یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی سایہ ٹہل رہا ہو۔ اس خیال سے ان کی نیند اڑ گئی کہ کہیں رات کے کسی حصّے میں یہ اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کریں۔

"کیوں نہ ہم یہ رات جاگ کر گزاریں؟" آصف نے تجویز پیش کی۔

"ابّا جان ہمیں بتا چکے ہیں کہ ان لوگوں کی بھی نگرانی کی جا رہی ہے۔ پھر ہمیں جاگنے کی کیا ضرورت ہے؟" آفتاب نے منہ بنا کر کہا۔

"کام چور ہو تم۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ کوئی چکّر چلا کر پولیس والوں کو بے ہوش کر دیں، مثلاً سرخ کیچوا پھینک کر۔ اور پھر چڑھ دوڑیں ہم پر۔"

"چڑھ دوڑیں ہم پر۔ تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا؟ مکان کے اردگرد تو پہرا موجود ہے۔ وہ کیسے اندر داخل ہو سکیں گے؟"

اُن کے پاس عجیب و غریب ہتھیار ہیں۔ وہ اُن کی مدد سے ان لوگوں کو بھی بے کار کر سکتے ہیں۔"

"تم تو زبردستی انھیں اندر بلانے پر تلے ہوئے ہو۔ میں کہتا ہوں آؤ، سو جائیں۔" آفتاب نے تنگ آ کر کہا۔

"چلو بھائی۔ اگر تم سونے پر تُل گئے ہو تو یوں ہی سہی۔ اگر کوئی بات ہوئی تو میں تو کہہ دوں گا کہ آصف ہی نے ہمیں سو جانے کا مشورہ دیا تھا۔"

"ہاں ہاں، کہہ دینا۔ الٹا ہمیں اس کی طرف سے بے فکر ہونے کے لیے کہہ چکے ہیں۔" آصف نے کہا۔

جوں ہی وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑے، فون کی گھنٹی بجی۔ وہ لپک کر فون کے پاس پہنچے۔ کامران مرزا

تھے۔ وہ کہہ رہے تھے:

"مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ....."

اچانک آواز آنا بند ہو گئی۔ آفتاب ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ لیکن لائن بند ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ہسپتال کے نمبر ڈائل کیے، مگر دوسری طرف سے کامران مرزا کی آواز کے بجائے ایک نئی آواز نے اسے چونکا دیا۔ آواز کہہ رہی تھی:

"کامران مرزا! تمھیں جو اطلاع ابھی ابھی ملی ہے وہ یہی ہے نا کہ انسپکٹر خالد جو پہلی رات ہی سے کانسٹیبلوں سمیت غائب تھا، ایک جگہ بے ہوش پڑا پایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ کانسٹیبل بھی ہیں اور ان کے پاس پانچ تیر بھی پڑے پائے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہم اُن کو موت کے گھاٹ بھی اُتار سکتے تھے، اور ہم تم لوگوں تک بھی اتنی ہی آسانی سے پہنچ سکتے ہیں جتنی آسانی سے ٹیلے فون کا سلسلہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے کنٹرول میں کر سکتے ہیں۔ ہم کیا ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں، اس چھوٹی سی مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ تم اور تمھاری پولیس ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ بس، ہم تم سے یہی کہنا چاہتے تھے۔ اب تم اپنے بیٹے کو جو اطلاع

دینا چاہو، دے سکتے ہو۔ ویسے تو وہ سُن ہی چکا ہے۔"

آواز آنی بند ہو گئی۔ کامران مرزا کی آواز بھی آفتاب کے کانوں میں نہ آئی۔ خود وہ پتھر کے بُت کی طرح کھڑا رہ گیا تھا۔

آصف اور فرحت اسے اِس عالم میں دیکھ کر بُری طرح گھبرا گئے تھے، اور جب اس نے انھیں ساری بات بتائی تو وہ دونوں بھی بُت بن گئے۔

مُقابلہ

آج ان کے گھر میں بہت رونق تھی۔ کامران مرزا صحت یاب ہو کر گھر آ چکے تھے۔ ان کے ساتھ ہی وزیرِ داخلہ، سیکرٹری صاحب اور خفیہ پولیس کے وہ دس سپاہی بھی آئے تھے، جنھوں نے گھر کی تلاشی لی تھی اور ناکام رہے تھے۔ وہ سب ڈرائنگ رُوم میں جمع تھے۔

"آپ لوگ یہاں اس لیے آئے ہیں کہ ان بچّوں کو وہ چیزیں برآمد کرتے دیکھیں، لیکن اب پروگرام بدل چُکا ہے۔" کامران مرزا نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وزیرِ داخلہ چونکے۔

"اب پروگرام یہ ہے کہ ان کی چھپائی ہوئی چیزیں میں تلاش کروں گا اور میری چھپائی ہوئی چیزیں یہ تلاش کریں گے۔"

"ہم ابھی تک نہیں سمجھے۔" وزیرِ داخلہ نے حیران ہو کر کہا۔

کامران مرزا نے انھیں تفصیل سے بات بتائی تو اُن

سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تو گویا آج باپ کا بیٹوں سے مُقابلہ ہے۔"

"جی ہاں۔ اب اگر آپ اِجازت دیں تو یہ کھیل شُروع کیا جائے۔"

"کیوں نہیں۔ یہ تو بہت ہی دِل چسپ کھیل ہو گا۔"

"تو پھر سب سے پہلے میں وہ چیزیں تلاش کروں گا جو آصف نے چھُپائی تھیں۔ اگر میں کامیاب نہ ہو سکا تو سب لوگوں کے سامنے یہ نکال کر دکھائیں گے۔ اس کے بعد یہ میرے چھُپائے ہوئے پستول تلاش کریں گے۔ اگر انھوں نے تلاش کر لیے تو مُقابلہ جیت جائیں گے اور میں انھیں پچاس پچاس روپے اِنعام دوں گا۔"

"لیکن مجھے تو آپ کو سو روپے دینے پڑیں گے۔" آصف بیچ میں بول پڑا۔

"کیا مطلب؟"

"ایک بار پہلے بھی آپ مجھے پچاس روپے دینے کا وعدہ کر چُکے ہیں، جو ابھی تک نہیں ملے، کیوں کہ اُسی رات آپ زخمی ہو گئے تھے۔ یاد کیجیے، جب میں نے یشوا کو دھکا دیا تھا اور اُس کا نشانہ چوک گیا تھا اور آپ نے مجھے شاباش دیتے ہوئے پچاس روپے دینے کا اِعلان کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے یاد آ گیا۔ اب میں تمھاری چھپائی ہوئی چیزوں کو تلاش کرتا ہوں۔ سب لوگ یہیں ٹھہریں۔ جوں ہی کسی کمرے میں مجھے وہ چیزیں ملیں، میں سب کو وہیں آنے کی دعوت دوں گا۔"

"ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔" کئی آوازیں ابھریں۔ کامران مرزا باہر چلے گئے۔

چند منٹ گزر گئے۔ آخر فضلو اندر آیا اور اس نے بتایا کہ کامران مرزا اُن کو دوسرے کمرے میں بُلا رہے ہیں۔ وہ سب جلدی سے اُٹھ کر اس کے پیچھے ہو لیے۔

کامران مرزا کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ یہ وہی کمرا تھا جس میں ٹیلے فون اور ٹیلے وژن موجود تھے۔ آصف، آفتاب اور فرحت حیرت زدہ رہ گئے۔ کم از کم کامران مرزا صحیح کمرے تک تو پہنچ گئے تھے۔ ان سب کے اندر داخل ہونے پر اُنھوں نے کہا:

"ابھی تک میں نے اس کمرے کی تلاشی نہیں لی۔ اسی کمرے پر کیا ہے، کسی کمرے کی بھی تلاشی نہیں لی۔ صرف جائزہ لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ چیزیں اسی کمرے میں ہیں۔"

"تو آپ نے ابھی تک ان چیزوں کو دیکھا نہیں؟" سیکرٹری

صاحب نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" کامران مرزا مسکرائے۔

"لیکن ہم اس کمرے کی تین بار تلاشی لے چکے ہیں۔ ایک ایک چیز چھان چکے ہیں۔" ایک سپاہی نے کہا۔

"اس کے باوجود وہ چیزیں اسی کمرے سے برآمد ہوں گی۔" کامران مرزا نے کہا۔

آفتاب، آصف اور فرحت کا بُرا حال تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کامران مرزا اتنی آسانی سے ان چیزوں تک پہنچ جائیں گے۔ آفتاب سے رہا نہ گیا۔ پوچھ ہی بیٹھا:

"ابّا جان، کیا آپ نے باقی تمام کمروں کا جائزہ بھی لیا ہے؟"

"ہاں۔ تمام کمروں کا۔"

"تب پھر آپ نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا کہ وہ چیزیں ان کمروں میں نہیں ہیں اور صرف اس کمرے میں موجود ہیں؟"

"میں نے ہر کمرے کی ہر چیز کو بغور دیکھا اور سوچا کہ ان کمروں میں کون کون سی ایسی چیزیں ہو سکتی ہیں جن میں وہ چیزیں چھپائی جا سکتی ہیں۔ مجھے صرف اس کمرے میں ایک ایسی چیز نظر آئی جس میں وہ چیزیں نہایت

آسانی سے چھپائی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ آصف کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس چیز کی تلاشی ضرور لی جائے گی پھر بھی اسے یقین تھا کہ کوئی ان چیزوں تک نہ پہنچ سکے گا۔ در اصل آصف نے بہت عقل مندی سے کام لیا اور ان چیزوں کو ایک ایسی جگہ چھپایا جہاں کی تلاشی بھی لی جانی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دس حضرات کو ناکامی ہوئی۔"

"آخر وہ چیزیں اس کمرے کی کس چیز میں ہیں؟"

"ٹیلے وژن میں۔" کامران مرزا نے ایک دم کہا۔

یوں لگا جیسے بم کا ایک دھماکا کمرے میں ہوا ہو۔ سپاہی ایک ساتھ چیخے "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے ٹی وی کو کھول کر دیکھا تھا۔ وہ چیزیں اس میں نہیں ہیں۔"

"وہ چیزیں اسی میں ہیں۔" کامران مرزا نے مسکرا کر کہا اور آفتاب، آصف اور فرحت کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ نہ صرف ان کی بلکہ منور علی خاں کا بھی مارے حیرت کے برا حال تھا۔

"منور علی، تم کیوں حیران ہو؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"در اصل ایک دن میں نے بھی ان چیزوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس دن یہ تینوں ہسپتال میں تھے اور میں گھر میں۔ میں نے ہر چیز کی تلاشی لی تھی۔ ٹیلے وژن

بھی کھول کر دیکھا تھا، اور یہ حقیقت ہے کہ وہ اس میں نہیں تھیں۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں۔ ضرور وہ چیزیں بعد میں یہاں رکھی گئی ہوں گی۔" عباس خاں بولا۔

"یہ غلط ہے۔ وہ چیزیں شروع سے ہی اس میں موجود رہی ہیں۔" آصف نے کہا۔

"اچھا، اب جا کر دیکھئے۔ کیا وہ ٹیلے وژن میں موجود ہیں؟" کامران مرزا نے عباس خاں سے کہا۔

"جی؟ کیا مطلب؟" عباس خان بری طرح چونکا۔

"ٹیلے وژن کھول کر دیکھیے اور مجھے بتائیے، کیا وہ چیزیں اس میں موجود ہیں؟" کامران مرزا نے پھر کہا۔

عباس خاں نے انھیں عجیب سی نظروں سے گھورا اور پھر ٹی وی کے پاس جا کر اس کا پچھلا ڈھکنا اتارنے لگا۔ ڈھکنا اترنے کے بعد اس نے اندر دیکھا، آنکھیں مل مل کر دیکھا اور پھر چلا کر بولا:

"یہ جھوٹ ہے؟"

"کیا مطلب؟" وزیر داخلہ اور سیکرٹری صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ چیزیں اس میں نہیں ہیں۔" عباس خاں نے کپکپاتی

آواز میں کہا۔

"کیا کہا؟ اس میں نہیں ہیں؟" کئی آوازیں اُبھریں۔

"جی ہاں۔نہیں ہیں۔"

پھر سبھی ٹی وی سیٹ پر اُمڈ پڑے۔ صرف کامران مرزا، آفتاب، آصف اور فرحت اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے رہ گئے۔ کامران مرزا بدستور مسکرا رہے تھے، جب کہ ان تینوں کے چہروں پر بے بسی جھلک رہی تھی۔ آخر وہ لوگ ٹی وی کے پاس سے ہٹ آئے۔

"وہ چیزیں اس میں نہیں ہیں۔" سیکرٹری صاحب نے کہا۔

"کیا یہ آپ سب کا فیصلہ ہے؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہم سب کا فیصلہ ہے کہ وہ اس میں نہیں ہیں۔"

"آئیے، میں دکھاتا ہوں۔" کامران مرزا نے کہا اور ٹی وی کے پاس پہنچ گئے۔ اُنھوں نے ایک نظر اندر ڈالی۔ وہ چیزیں انھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ سب جھکے ہوئے ٹی وی سیٹ کے اندر دیکھ رہے تھے، جس میں بے شمار ٹیوبوں اور تاروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔

"یہ دیکھیے۔ یہ تین چیزیں جنھیں آپ ٹیوبیں سمجھ رہے ہیں، دراصل وہ تین شیشیاں ہیں جو ٹیپ سے چپکائی گئی ہیں۔ آپ لوگوں کی جب ان پر نظر پڑی ہو گی تو آپ نے

انھیں ٹیوبیں خیال کیا ہو گا۔ اب رہ گئیں وہ تین ڈبیاں، تو آصف نے یہاں اور بھی چالاکی سے کام لیا۔ اس نے تینوں ڈبیوں کو اُوپر نیچے رکھ کر انھیں ٹیپ میں لپیٹ دیا اور پُرزوں کے عین درمیان میں ٹیپ سے چپکا دیا۔ اب یہ بھی ٹی وی کا ایک پُرزہ دکھائی دینے لگیں۔ یہ دیکھیے، یہ رہیں وہ۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے ایک چوکور سی چیز اندر سے اُکھاڑ لی اور اس پر سے ٹیپ اُتارنے لگے۔

"اب رہ گیا وہ تیر، تو اس کا مسئلہ بالکل سیدھا ہے۔ وہ صرف ڈیڑھ انچ کا پتلا سا سُرخ رنگ کا تیر ہے، جسے تاروں کے جال میں آسانی سے چھپایا جا سکتا ہے، لیکن آصف نے یہاں بھی ہُنر مندی دکھائی۔ تیر کے اُوپر ایک سُرخ رنگ کا تار لپیٹ کر اسے تاروں کے گچھے میں چھپا دیا۔ اب بھلا تیر کیسے نظر آ سکتا تھا۔ وہ تو ایک تار میں تبدیل ہو چکا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے کامران مرزا نے تار میں لپٹا ہوا تیر نکال لیا اور اُس پر سے تار اُتارنے لگے۔ وہ سب اس طرح خاموش تھے جیسے اُن پر جادُو کر دیا گیا ہو۔ وہ آصف، آفتاب اور فرحت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ آخر سیکرٹری کے مُنھ سے نکلا:

"یشوما نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس مہم پر صرف دو آدمی اور اُن کے بچّے روانہ ہو سکتے ہیں۔ کیا انسپکٹر جمشید اور اس کے بچّے بھی ایسی ہی حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہیں؟"

"ہاں۔ میں انھیں جانتا ہوں۔ وہ ہم سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔" کامران مرزا بولے۔ پھر ان تینوں کی طرف مڑے۔

"یہ مقابلہ تو میں جیت چکا ہوں۔ اب تمھاری باری ہے۔ جاؤ اور وہ تینوں پستول ڈھونڈ نکالو۔"

"بس ابّا جان۔ اس شکست کے بعد ہم میں ہمّت نہیں رہی۔" آفتاب بولا۔ اُس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"جی ہاں، ہم جانتے ہیں کہ ہم یہ مقابلہ بھی ہار جائیں گے۔"

"ارے بھئی، کوشش تو کر کے دیکھ لو۔" کامران مرزا نے اُنھیں حوصلہ دیا۔ آخر وہ پستول تلاش کرنے کے لیے تیّار ہو گئے۔ وہ کئی دن سے جائزہ لیتے رہے تھے۔ اسی کے مطابق اُنھوں نے ہر اُس جگہ کی تلاشی لے ڈالی مگر کامیابی اُن سے کوسوں دُور تھی۔ آخر وہ تھک ہار کر واپس آئے اور اپنی ناکامی کا اعلان سب کے سامنے کر دیا۔

"خیر، کوئی بات نہیں۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ تینوں میرے کمرے میں میز کے پاس ردّی کی ٹوکری کے اندر پڑے ہیں۔"

"ارے!" اُن کے منھ سے نکلا۔

"جاؤ فضلو، میرے کمرے سے ردّی کی ٹوکری نکال لاؤ۔"

فضلو فوراً ہی ٹوکری اُٹھا لایا۔ وہ اُوپر تک کاغذوں سے بھری ہوئی تھی۔

"اب تم اس میں سے وہ پستول نکال لو۔" کامران مرزا بولے۔

آفتاب نے ٹوکری فرش پر اُلٹ دی۔ بے شمار کاغذوں کے پُرزے فرش پر آ رہے، لیکن پستول برآمد نہیں ہوئے۔

"ارے! پستول تو اس میں نہیں ہیں۔" آصف کے منھ سے نکلا۔

سب ٹوکری پر جُھک گئے۔ اس کی تہہ نظر آ رہی تھی۔ کاغذوں کے ڈھیر میں ہاتھ مار کر دیکھا گیا لیکن پستول کہیں نظر نہ آئے۔

"ابّا جان، کیا آپ مذاق کے موڈ میں ہیں؟" آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں تو۔ میں اور تم سے مذاق کروں؟" وہ مسکرائے۔
"تو پھر پستول تو ٹوکری میں نہیں ہیں؟"
"نہیں بھئی، اسی میں ہیں۔"
"کیا؟ اسی میں ہیں؟" وہ سب بُری طرح چونکے۔
"ہاں۔ لاؤ، میں نکالے دیتا ہوں۔ یہ ٹوکری دیکھ رہے ہو؟ نیلے پلاسٹک کی ہے۔ میں نے پستول اس کی تہہ میں رکھ کر اوپر پلاسٹک منڈھ دیا ہے۔ یہ دیکھو۔" یہ کہہ کر اُنھوں نے پلاسٹک اتار پھینکا اور ٹوکری کو ایک بار پھر اُلٹایا۔ پستول ٹوکری میں سے نکل کر فرش پر گر پڑے۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی اور وہ سب چونک پڑے۔

اِن میں کیا ہے؟

کامران مرزا نے ان سب کو چونکتے دیکھ کر پُرسکون لہجے میں کہا "فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضرور سب انسپکٹر ریاض ہوگا۔ آفتاب، تم جاکر اسے یہاں لے آؤ۔"

"جی، اچھا۔" آفتاب نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ سب انسپکٹر ریاض کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

"اور اب میرا خیال ہے، آپ کے ان آدمیوں کا یہاں کوئی کام نہیں رہ گیا۔ اس لیے انھیں بھیج دیا جائے۔" کامران مرزا نے وزیرِ داخلہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔" کامران مرزا نے کہا۔ پھر وہ سب انسپکٹر ریاض کی طرف متوجّہ ہوئے اور بولے "ہاں بھئی، ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ انسپکٹر خالد اور اس کے ساتھیوں کا کیا حال ہے؟"

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ان کے دماغ میں خلل آگیا ہے۔ وہ نہ کوئی بات کرتے ہیں نہ کسی کی بات سمجھنے کی

صلاحیت اُن میں ہے۔"

"اِشاروں سے بات کر کے دیکھا گیا؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہ بھی کر چکے ہیں۔"

"وہ پانچ تیر لانے ہو جو اُن کے پاس پڑے پائے گئے تھے؟"

"جی ہاں۔ لایا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پلاسٹک کا لفافہ اُن کے حوالے کر دیا۔ اُنھوں نے میز پر اُلٹ دیا۔ میز پر پہلے بھی ایک تیر موجود تھا میں سے نکلنے والے پانچ تیروں میں اور اس تیر میں ذرّہ برابر بھی فرق نہ تھا۔

"یہ تیر میری سمجھ میں نہیں آئے۔ نہ جانے ان کی نوکوں پر کون سا زہر لگا ہے کہ اِنسان کو تڑپنے کی بھی مہلت نہیں دیتا۔ یشوما بولتے بولتے اس طرح خاموش ہو گیا تھا جیسے اسے نیند آ گئی ہو۔" کامران مرزا نے کہا۔ پھر سب انسپکٹر ریاض اور اس کے ساتھیوں سے بولے "تم لوگ جا سکتے ہو۔ میں ان کا مُعاینہ خود کر لوں گا اور خالد وغیرہ سے بھی خُود ملوں گا۔"

اچانک آفتاب کو ایک خیال آیا۔ اس نے کہا "ابّا جان،

اس رات والی بات رہ گئی، جب آپ کو سب انسپکٹر خالد کے متعلّق اِطلاع ملی تھی اور اپ نے ہمیں فون کیا تھا۔ لیکن سلسلہ درمیان ہی رُک گیا تھا۔ آخر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں اب اس طرف ہی آ رہا تھا۔" کامران مرزا بولے پھر اُنھوں نے وزیرِ داخلہ اور سیکرٹری صاحب کو اس رات واقعے کے متعلّق بتایا۔ دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر خطرناک ہیں۔ یہ ٹیلے فون کی لائنوں کو اپنے کنٹرول میں لے سکتے ہیں تو پھر ریڈیو اور ٹیلے وژن بھی ان سے محفوظ نہیں ہوں گے۔"

"پھر، آپ نے کیا سوچا ہے؟" وزیرِ داخلہ گھبرا کر بولے

"میں ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

"اور وہ نتیجہ کیا ہے؟"

"ہم سب ایک ایسے خطرے میں گھر چکے ہیں جس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ کاش! یشوما چند منٹ اور زندہ رہ جاتا۔"

"اب کیا ہو گا؟ کیا ہم تباہ ہو جائیں گے؟ ہم سب ختم

ہو جائیں گے ؟"

"نہیں۔ میں اس ملک کو ..... اس ملک میں رہنے والے اپنے بھائیوں کو ..... ننھے منّے پھول جیسے بچّوں کو ختم ہوتے نہیں دیکھ سکوں گا۔"

"لیکن آپ کیا کریں گے ؟ آپ تنہا اتنی بڑی طاقت سے ٹکرائیں گے ، جب کہ ان کے بارے میں یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کا ہیڈکوارٹر کہاں ہے ؟"

"میرے ذہن میں سب باتیں موجود ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اور میرے بچے مجرموں کی نظر میں ہیں اور ہم اس وقت تک اس مہم پر روانہ نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے آس پاس کے مجرموں کو ان کے انجام تک نہ پہنچا دیں۔ میں آپ کو چند دن کے اندر اندر بتاؤں گا کہ میرا پروگرام کیا ہے۔ پہلے میں کچھ کام نپٹانا چاہتا ہوں۔ بہتر ہو گا کہ آپ میرے گھر کے گرد پولیس کا ایک دستہ تعینات کرا دیں۔"

"بہت اچھا۔ یہ آج ہی ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ آخر وزیرِ داخلہ بولے "تو پھر ہم چلتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ دو تین دن تک آپ ہمیں بہت کچھ بتا سکیں گے۔"

"جی ہاں۔ آپ مطمئن [illegible] اسی وقت سے کام

شروع کر رہا ہوں۔ آپ اتنا اور کر دیں کہ ایک بلٹ پروف (جس پر گولی اثر نہ کرے) گاڑی کا بندوبست کر دیں۔ مجھے ان دنوں میں کئی بار گھر سے باہر بھی نکلنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ بھی ہو جائے گا۔" انھوں نے کہا اور ان سب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

کامران مرزا بولے "اور اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کیا چیزیں ہیں۔"

"ایک بات تو بالکل سامنے کی ہے۔ اس صورت میں جب کہ وہ باقی چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے [illegible] کی بازی لگا چکے ہیں، یہ تیر وہ خود ہی چھوڑ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انھیں ان کی کوئی پروا نہیں۔" آفتاب نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے، لیکن اس وقت تک میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ تیر بنے ہوئے کس چیز کے ہیں۔ یہ نہ تو کسی دھات کے ہیں، نہ پلاسٹک کے، اور نہ ہمارے ملک میں پائی جانے والی کسی قسم کی لکڑی کے۔" کامران مرزا نے فکر مند ہو کر کہا۔

سب نے ان تیروں کو الٹ پلٹ کر دیکھا مگر کسی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ آخر وہ ان شیشیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ کامران مرزا [illegible] کا ڈھکنا کھول کر اسے

سُونگھا۔ اس میں سے کسی قسم کی کوئی بُو نہیں آ رہی تھی۔ اُنھوں نے ایک تنکے کی مدد سے سیّال کاغذ پر لگا کر دیکھا۔ سیّال تیل کی مانند ایک دھبّا سا بنا کر خشک ہو گیا۔

"اس کے بارے میں بھی ہم کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسے بھی چھوڑ دو۔" کامران مرزا نے جھلّا کر کہا اور سُنہری مائل نیلی ڈبیوں میں سے ایک اُٹھا کر اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ ان ڈبیوں پر کسی ڈھکنے وغیرہ کا کوئی نشان نہ تھا۔ اُنھوں نے ہر ہر طرح سے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ آخر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ کافی دیر تک سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ پُر خیال لہجے میں بولے:

"ٹھیک ہے۔ مجھے ان چیزوں کو لے کر پروفیسر جیلانی کے پاس جانا ہو گا۔ یہ مسئلہ اُن کے بغیر حل نہیں ہو گا۔"

"پروفیسر جیلانی؟ یہ کون ذاتِ شریف ہیں؟" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"ارے! تم پروفیسر جیلانی کو نہیں جانتے؟ وہ اس ملک کے مشہور سائنس دان ہیں۔ وہ ضرور اس سلسلے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ لیکن وہ حد درجہ چڑچڑے اور ضدی ہیں۔

وزیر اعظم کی سفارش بھی نہیں مانتے۔"

"تو پھر آپ ان سے کس طرح مدد لے سکیں گے؟"

"اس کے لیے بھی کچھ سوچنا ہو گا۔ بہر حال، سب سے پہلے تو میں انسپکٹر خالد وغیرہ سے ملوں گا۔ پھر اُن پانچ قیدیوں سے بھی ملنا ہے جو سب انسپکٹر ریاض کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے۔ اس کے بعد پروفیسر جیلانی سے ملوں گا۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ کامران مرزا نے جھپٹ کر ریسیور اُٹھایا۔ دُوسری طرف سے کوئی تیزی سے کہہ رہا تھا:

"ہیلو! ہیلو!"

"کہو، کیا بات ہے؟"

"سیاہ کار اچانک ایک سمت میں بھاگ نکلی ہے۔ ہم اس کے تعاقب میں ہیں۔"

"بہت خوب! تعاقب جاری رکھو اور مجھے فون پر اِطلاع دیتے رہو۔" کامران مرزا یکایک خوش ہو گئے۔ "دیکھو! اس سے پہلے بھی سیاہ کار دو مرتبہ تم لوگوں کو دھوکا دے کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ آج اس کا پیچھا نہ چھوڑنا۔ ہمیں ہر حال میں اُن کا ٹھکانا معلوم کرنا ہے۔"

"ہم ہر طرح محتاط ہیں، تاہم سیاہ کار کی رفتار ہماری گاڑی کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ نہ جانے وہ کس قسم کی

کار ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا

"اوہ!" کامران مرزا کے منہ سے نکلا "تو کیا وہ آج بھی نکل جانے میں کامیاب ہو جائے گی؟"

"آثار تو ایسے ہی ہیں۔ ہم اس کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔" دوسری طرف کی آواز بوکھلائی ہوئی تھی۔

"یہ بہت بری خبر ہے۔ اچھا، میں آ رہا ہوں۔ سمت بتاؤ۔"

"سمت؟..... دیکھیے ہم.... مگر نہیں۔ اب اس سے کوئی فائدہ نہیں ـــ وہ ایک دم ہماری نظروں سے غائب ہو گئی ہے۔"

"دھت تیرے کی۔ آج پھر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن خیر، کل ایسا نہیں ہوگا۔ کل.... یہ لوگ خود ہمیں اپنے ٹھکانے پر لے جائیں گے۔" کامران مرزا نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

"جی؟ کیا مطلب؟" دوسری طرف سے چونک کر کہا گیا، مگر کامران مرزا نے کوئی جواب دیے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

خطرناک منصوبہ

انسپکٹر خالد اور اس کے ساتھیوں سے ملاقات بے کار ثابت ہوئی۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ خدا جانے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔ آخر کامران مرزا تھانے پہنچے۔ چاروں قیدیوں کو ایک خاص کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں مختلف آلات نصب تھے۔ ان میں بجلی کی کرسی بھی موجود تھی، جس پر بیٹھ کر بڑے بڑے مجرم بھی فرفر بولنے لگتے تھے، لیکن کامران مرزا کو بتایا گیا تھا کہ یہ چاروں اس کرسی پر بھی کچھ نہیں بولے تھے۔ کامران مرزا نے اُن سے مسکراتے ہوئے بات کی:

"دیکھیے، صرف اتنا بتا دو کہ تم لوگوں کا ٹھکانا کہاں ہے؟ ہمارے ملک میں ہے، یا کہیں باہر؟ اگر تم اس سوال کا جواب دے دو تو ہم تمھیں رہا کر دیں گے۔"

ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ انھوں نے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

کہ ان پر ایک بار پھر مختلف آلے استعمال کیے جائیں۔ ایسا ہی کیا گیا، لیکن وہ اس پر بھی نہ بولے۔ آخر کامران مرزا نے غصّے بھرے لہجے میں اعلان کیا:

"کل یہ چاروں اس طرح بولیں گے، جیسے پہلی جماعت کا بچّہ اپنا سبق یاد کرتا ہے۔ میں ان پر اپنا تیار کردہ ایک آلہ آزماؤں گا۔ کل شام ٹھیک چار بجے۔"

لیکن کامران مرزا اپنی یہ حسرت پوری نہ کر سکے۔ دوسرے دن ابھی وہ بیدار ہی ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ تھانے سے فون آیا تھا۔ ایک انسپکٹر بات کر رہا تھا۔ کامران مرزا اس کے الفاظ سن کر سکتے میں رہ گئے۔ وہ کہہ رہا تھا:

"ان چاروں کے سینوں میں چھوٹے چھوٹے تیر گھسے ہوئے ہیں اور جسم پتھر کی طرح سخت اور برف کی مانند سرد ہو چکے ہیں۔"

کامران مرزا بچوں سمیت تھانے کی طرف بھاگے، مگر وہاں کیا تھا، حوالات میں وہ چاروں فرش پر پڑے، اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کو گھور رہے تھے۔

"انھیں اس لیے ختم کر دیا گیا کہ کہیں میں ان سے کچھ معلوم نہ کر لوں۔"

"اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔" کامران مرزا نے گھر آ کر کہا "ہر طرف ناکامی کا منھ دیکھنا پڑ رہا ہے، لیکن اب میں وہی کروں گا جو مجرم چاہتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" منوّر علی خاں بھی چونک اٹھے۔

"ہاں، منوّر علی۔ اب تمھیں بھی کچھ کام دکھانا ہے۔ آج شام کے اخبارات میں یہ خبر پہلے صفحے پر شائع ہو گی کہ میں شام کو مجرموں سے حاصل ہونے والی چیزیں لے کر پروفیسر جیلانی کے پاس جا رہا ہوں، تاکہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ وہ کیا چیزیں ہیں؟"

"لیکن اس سے کیا ہو گا؟" آفتاب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو؟ کیا تمھاری عقل گھاس چرنے گئی ہے؟" کامران مرزا نے اُسے بُری طرح گھورا۔ "اس سے یہ ہو گا کہ مجرم ہمیں پروفیسر جیلانی کے گھر نہیں جانے دیں گے اور چوں کہ ہمارے پاس وہ چیزیں بھی نہیں ہوں گی جن کو حاصل کرنے کے لیے ان کی جان بنی ہے، اس لیے وہ ہمیں گھیر کر اپنے ٹھکانے پر لے جانے کی کوشش کریں گے۔"

"لیکن وہ پولیس کے خوف سے ایسا کیوں کر کر سکتے ہیں؟"

"ہمارے ساتھ کوئی نہ ہوگا۔ نہ آگے، نہ پیچھے۔ اس بات کی خاص ہدایت کر دی جائے گی۔ جب ہم دیکھیں گے کہ ہم تنہا ہیں تو وہ ضرور وہی کریں گے، جو میں نے بتایا ہے۔ اور ..... یہاں سے کام شروع ہوگا منوّر علی خاں کا۔" کامران مرزا بہت دیر بعد مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" منوّر علی چونکے۔

"صرف تم ہمارے پیچھے پہنچو گے۔ یہ سہل ناک کام میں تمہارے بھروسے کرنا چاہتا ہوں، لیکن پہلے میں اخبارات میں خبر دینے کا انتظام کر لوں۔"

"تو کیا آپ سچ مچ وہ چیزیں لے کر چلیں گے؟"

"دیکھتے جاؤ۔ ہوتا کیا ہے۔" انھوں نے کہا اور اخبارات کے دفاتر میں فون کرنے لگے۔

سیکرٹری صاحب نے شام کے اخبار میں یہ حیرت انگیز خبر پڑھی تو دنگ رہ گئے۔ انھوں نے فوراً کامران مرزا کو فون کیا:

"بھئی، یہ کیا؟ کیا آپ ان چیزوں کو اپنے ہاتھ سے گنوانا چاہتے ہیں؟"

"جی، کیا مطلب ان چیزوں کی بات کر رہے ہیں؟" کامران مرزا نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر کہا۔

"ارے بھئی، اخبارات میں یہ خبر آپ کی مرضی سے ہی شائع ہوئی ہے نا؟"

"اوہ، اچھا۔ آپ کا اشارہ اس طرف ہے۔ جی ہاں۔ یہ خبر میں نے ہی شائع کرائی ہے۔"

"مگر کیوں؟ مجرم راستے میں آپ لوگوں کو گھیر لیں گے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان کے پاس کیسے کیسے ہتھیار ہیں۔ پولیس ان کا مقابلہ کہاں کر سکے گی۔"

"یہ ٹھیک ہے، پولیس مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ اس لیے میں اپنے ساتھ پولیس نہیں لے جا رہا۔ صرف اپنے بچوں کو لے جاؤں گا۔ پروفیسر جیلانی کو یہ چیزیں دکھانا بہت ضروری ہے۔ صرف وہی ان کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے۔"

"تو پھر اخبار میں دینے کی کیا ضرورت تھی؟ چپ چاپ چلے جاتے۔"

"میں چپ چاپ بھی ان کی نظروں سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ہر لمحے ان کی نظروں میں ہوں۔"

اسی وقت وزیر داخلہ کا فون آیا۔ انھوں نے بھی اس پروگرام پر حیرت ظاہر کی، لیکن بعد میں یہ کہہ کر سلسلہ بند کر دیا:

"ٹھیک ہے۔ آپ مختار ہیں۔ جو جی چاہے کریں۔ لیکن حالات سے باخبر کرتے رہنا۔"

ٹھیک چھ بجے شام کامران مرزا، آفتاب، آصف اور فرحت گھر سے نکلے۔ جس کار کے لیے اُنھوں نے وزیرِ داخلہ سے درخواست کی تھی وہ مہیّا کر دی گئی تھی اور اس وقت ان کے گیراج میں تھی۔ اسے ایک باوردی ڈرائیور لے کر آیا تھا، جو وہیں موجود تھا۔ کامران مرزا اور بچّوں کے پیچھے ڈرائیور بھی گھر سے باہر نکلا اور گیراج میں سے کار نکال لایا۔

اس وقت کامران مرزا کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔ اُنھوں نے ڈرائیور کو اندر جا کر آرام کرنے کے لیے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان تینوں کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کامران مرزا سامنے دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے ایک بار بھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھا تھا۔ یہی حالت بچّوں کی تھی۔ پھر اُنھوں نے کار کا ایک خفیہ خانہ کھولا اور وہ پیکٹ اس میں رکھ دیا۔ ساتھ ہی ان کے مُنھ سے دبے لہجے میں نکلا:

"خُدا حافظ!"

کار ایک دھچکے سے آگے بڑھی اور پروفیسر جیلانی کے گھر جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ کامران مرزا نے اپنے آگے

دُور دُور تک دیکھا۔ سیاہ کار کا کہیں پتا نہ تھا۔ پھر اُنھوں نے پچھلا منظر دکھانے والے آئینے میں دیکھا۔ سیاہ کار پیچھے نہیں تھی لیکن وہ ذرا پریشان نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ مجرم اتنے سیدھے نہیں ہیں کہ اِسی جگہ سے تعاقب شروع کر دیتے جب کہ انھیں معلوم تھا کہ ان کو پروفیسر جیلانی کے گھر جانا ہے۔

پروفیسر جیلانی کی کوٹھی شہر سے باہر ایک الگ تھلگ مقام پر تھی۔ اس کے آس پاس کوئی مکان نہ تھا۔ اُنھوں نے اِس جگہ کا انتخاب اِس لیے کیا تھا تاکہ ان کے تجربوں میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ یہ کوٹھی شہر سے سترہ میل دُور تھی۔ ابھی تک کامران مرزا کو سیاہ کار نظر نہیں آئی تھی۔

"ابّا جان، کیا خیال ہے؟ کہیں وہ لوگ ہماری سکیم کو سمجھ تو نہیں گئے؟" آفتاب بولا۔

"یہی تو بات ہے۔ سمجھنے کے باوجود بھی وہ وہی کریں گے جو میں چاہتا ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ وہ کسی نہ کسی موڑ پر ہمارا اِنتظار ضرور کر رہے ہوں گے۔"

اچانک آفتاب کامران مرزا کی طرف مڑتے ہوئے بولا:

"ابّا جان، انکل مُنوّر علی خاں کہاں ہیں؟"

"میدانِ عمل میں۔" کامران مرزا نے گول مول سا جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔
"یوں سمجھو کہ اِس مُہم میں وہ بہت اہم کام کریں گے۔"
"لیکن کیسے؟ وہ یہاں ہیں کب؟" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔
"احمق ہو تم۔ وہ ہم سے بہت پیچھے ہوں گے۔" آصف نے کہا۔
"کیوں انکل، کیا آصف ٹھیک کہہ رہا ہے؟" فرحت نے پوچھا۔
"پتا نہیں۔ شاید اس کا خیال ٹھیک ہے۔" کامران مرزا بولے۔
"آپ ہمیں بتانا نہیں چاہتے۔ یہی بات ہے نا؟"
"چلو، یہی سمجھ لو۔ یہاں سے پروفیسر جیلانی کی کوٹھی صرف سات میل دُور ہے۔ اب تک سیاہ کار کو سامنے آجانا چاہیے تھا۔"
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ اسے ہماری کوئی چال سمجھ رہے ہوں اور خیال کر رہے ہوں کہ ہمارے پیچھے پولیس کے دستے آ رہے ہیں۔" آفتاب نے کہا۔
"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ وہ اپنا اطمینان کرنے کے بعد ان چیزوں کو حاصل کرنے ضرور آئیں گے۔ وہ یہ کسی طرح بھی پسند نہیں کریں گے کہ یہ چیزیں پروفیسر جیلانی تک پہنچ

جائیں۔"
"تو کیا آپ یہ چیزیں اُن کے حوالے کرنے کا اِرادہ رکھتے ہیں؟" آصف نے پوچھا۔
"جو واقعات پیش آنے والے ہیں، وہ تم دیکھ ہی لو گے۔" کامران مرزا بولے۔
"اچھا یہ تو بتا دیں، اگر انکل مُنوّر علی میدانِ عمل میں ہیں تو کیا ہم میدانِ عمل سے باہر....؟" آفتاب کے الفاظ درمیان ہی میں رہ گئے۔
"کیا ہوا؟ تمھاری زبان پر سکتہ کیوں طاری ہو گیا؟"
"تھا جس کا انتظار وہ شہکار آگیا۔" آفتاب کے منہ سے نکلا۔ اس کی [illegible] منظر دکھانے والے آئینے پر جمی تھی۔ سب نے چونک کر آئینے میں دیکھا۔ دُور..... بہت دُور سیاہ رنگ کا دھبّا سا سڑک پر نظر آ رہا تھا۔
"تو کیا یہ سیاہ کار ہے؟" آصف نے چونک کر کہا۔
"تمھیں کیا نظر آتا ہے؟" آفتاب نے جل کر کہا۔
"ایک سیاہ دھبّا۔"
"ابّا جان، ہم شہر سے تو نکل ہی آئے ہیں، کیوں نہ ذرا رفتار کم کر لیں تاکہ آصف کی یہ غلط فہمی دُور ہو جائے کہ یہ سیاہ دھبّا نہیں، کار ہے۔" آفتاب نے مشورہ دیا۔

کامران مرزا کچھ کہنے والے ہی تھے کہ ان کی نظر سامنے اُٹھی کی اُٹھی رہ گئی۔ پھر وہ پُرجوش لہجے میں بولے:

"اب تو مجھے رفتار ضرور ہی آہستہ کرنی ہو گی۔"

"کیا مطلب؟"

"سامنے دیکھو۔" وہ بولے۔

اُنھوں نے چونک کر دیکھا۔ ان کے آگے بھی کافی فاصلے پر ایک سیاہ کار سڑک پر دوڑ رہی تھی، لیکن اس کی رفتار لمحہ بہ لمحہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

"یہ سیاہ کاریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سڑک میں سے اُگ آئی ہیں اور اُگتے ہی دوڑنے کے قابل بھی ہو گئی ہیں۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا، یہ لوگ اپنی چیزیں حاصل کرنے ضرور آئیں گے۔"

"لیکن آپ تو اُن کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچنا چاہتے تھے؟"

"ہاں۔ ہم انشاءاللہ وہاں پہنچیں گے۔" کامران مرزا بولے۔

جوں جوں اگلی سیاہ کار ان سے نزدیک ہو رہی تھی، وہ بھی کار کی رفتار آہستہ کرتے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ

ہی پچھلی کار بھی اب انھیں صاف دکھائی دینے لگی تھی۔

"دیکھ لو۔ وہ تمھارا دھبّا آ رہا ہے۔" آفتاب نے مُسکرا کر کہا۔

"ہم دو کاروں کے درمیان پھنس گئے ہیں۔" فرحت نے کہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا، اور پُورے بدن پر کپکپی طاری تھی۔

"تو میں کب کہتا ہوں کہ نہیں پھنسے۔ بے شک ہم دو سیاہ کاروں کے درمیان پھنس گئے ہیں لیکن تمھارا دم کیوں نکل رہا ہے۔ یہ گھگھی کیوں بندھ گئی ہے، تمھاری؟"

"ان..... انکل .... اسے سمجھائیے۔" فرحت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا بیٹی۔ آفتاب، آصف، سمجھ جاؤ۔"

"کیا مطلب؟ کیا سمجھ جائیں؟" دونوں نے حیران ہو کر کہا۔

"جو فرحت تمھیں سمجھانا چاہتی ہے۔" کامران مرزا نے کہا۔

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ فرحت کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک ان دونوں کے چہرے پر حیرت کے آثار ظاہر ہوئے۔

"اوہ! ہم سمجھ گئے، فرحت کیا چاہتی ہے۔"

"بہت دیر سے سمجھے۔ فرحت کا ذہن اس وقت تم دونوں

سے زیادہ تیزی سے کام کر رہا ہے۔ تم کو اس حد تک خوف زدہ ہو جانا چاہیے کہ دشمن یہ سمجھ لیں کہ ہم اس کے جال میں پھنس گئے ہیں، اور یہ کہ ہمیں اس کی اُمید ہرگز نہ تھی۔" کامران مرزا نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے، ابا جان۔" آفتاب نے کہا اور حیران ہو کر فرحت کو دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" آصف نے پوچھا۔

"میں اسے اتنا عقل مند نہیں سمجھتا تھا۔" آفتاب نے کہا۔

"تو پھر کتنا سمجھتے تھے؟" آصف نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

"بس واجبی سا، اتنا کہ ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہونے کے قابل ہے اور بس۔"

"دیکھیے انکل، یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔" فرحت نے تلملا کر کہا۔

"اڑا لینے دو بیٹی۔ تمہارا کیا جاتا ہے۔" کامران مرزا بولے۔

"ٹھیک ہے۔ اڑا لو۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچا ہی کرتی ہے۔"

"کار میں بیٹھ کر کیا مذاق اڑائیں گے۔ مذاق تو ہم تمہارا دشمنوں کے خفیہ اڈے پر پہنچ کر اڑائیں گے۔"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کوئی پتنگ اڑانے کا ارادہ

ہو۔"

کاریں اب ان سے صرف ایک ایک میل کے فاصلے پر رہ گئی تھیں۔ چونکہ یہ علاقہ شہر سے باہر اور بالکل غیر آباد تھا، اس لیے سڑک پر دن میں ایک آدھ ہی کار گزرتی ہو گی۔ یوں بھی یہ سڑک آگے جا کر ختم ہو جاتی تھی اور گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف لمبے لمبے درخت اور گنجان جھاڑیاں تھیں۔

"انھوں نے جگہ خوب چنی ہے۔" آصف نے دشمنوں کی تعریف کی۔

"تمہاری طرح بدھو تو نہیں ہیں۔" فرحت نے کہا۔

"شکر ہے۔ تم بھی اس قابل ہوئیں کہ منہ سے ایک جملہ تو نکلا۔ ورنہ تمہارا تو رنگ ہی اڑ گیا تھا۔"

"وہ تو اب بھی اڑا ہوا ہے۔" فرحت بولی۔ دونوں نے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ شاید کوئی بڑے سے بڑا اداکار بھی سہم جانے کی اس قدر جان دار اداکاری نہیں کر سکتا تھا۔

"بس اب تم بھی فرحت کا ساتھ دو۔" کامران مرزا نے ہدایت کی۔

"جی اچھا۔" دونوں ایک ساتھ بولے۔

اور پھر اُن کے چہرے بھی خوف سے پیلے پڑ گئے ہاتھ پیر لرزنے لگے۔

"ارے باپ رے! —— ہم تو پھنس گئے۔" آصف کے مُنھ سے نکلا۔

"اف اللہ! اب کیا ہوگا!!" آفتاب نے کہا۔

"وہ ..... وہ ... وہی ...." فرحت ہکلائی۔

"یہ کیا کہا تم نے؟ کیا یہ کسی اور زبان کے لفظ ہیں؟ یہاں تو انکل بھی نہیں ہیں کہ ترجمہ ہی کر دیں۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

"مم .... میں .... میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ وہ .... وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔"

"ہاں، اس میں کیا شک ہے۔" آصف نے کہا۔

اُنھوں نے دیکھا، اگلی کار آڑی ہو کر رُک گئی تھی، اس طرح کہ ان کی کار کسی طرح بھی آگے نہیں نکل سکتی تھی۔

"لو بھئی تیار! ان کا پروگرام شروع ہو گیا ہے۔" کامران مرزا نے انھیں خبردار کیا۔

"لیکن انکل، ابو کا تو دُور دُور تک پتا نہیں۔" فرحت نے فکر مند ہو کر کہا۔

اب اگلی کار میں سے تین آدمی نکل کر اُس کی پُشت سے لگ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشین گنیں بھی تھیں اور گیس کے پستول بھی۔

"ارے باپ رے! گیس کے پستولوں کے ساتھ مشین گنیں بھی ہیں۔"

"ہاں، پُورا اِنتظام کر کے آئے ہیں۔" آفتاب بولا۔

اِتنی دیر میں پچھلی کار بھی ان کے عین پیچھے پہنچ گئی اور وہ بھی آڑی کر کے کھڑی کر دی گئی۔ اس میں سے بھی تین آدمی اُترے۔ اُن کے ہاتھوں میں صرف گیس پستول تھے۔

کامران مرزا پہلے ہی کار کا انجن بند کر چکے تھے، اور اندر بیٹھے ہوئے اُنھیں گھُور رہے تھے۔ دُوسری طرف ان تینوں بچّوں نے بھی خوف زدہ ہو جانے کی ایکٹنگ شروع کر دی تھی۔ وہ کانپ رہے تھے۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔

اچانک مشین گنوں والے تین آدمی کار کی پُشت سے ہٹ کر اُن کی طرف بڑھنے لگے، اور پھر ایک مشین گن کی نال کامران مرزا کے سینے سے آلگی۔ دُوسری کی نال کا رُخ ان تینوں کی طرف ہو گیا۔ تیسرا آدمی اب بھی ان کی کار کے بالکل

سامنے [illegible] تھا۔ پچھلے تین پستول تانے ان کے پیچھے ہی کھڑے تھے۔

کیا لیتھوما کے دشمن کامران مرزا سے وہ چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے؟

کامران مرزا دشمنوں کے ٹھکانے پر پہنچنا چاہتے تھے لیکن انھیں نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک عجیب و غریب دنیا کے قیدی بن کر رہ جائیں گے۔

منوّر علی خان جنگل میں بُری طرح پھنس جاتے ہیں۔

اُنھوں نے اپنی پوری زندگی میں اس قدر خوف ناک شکار نہیں کھیلا تھا۔ یہ شکار کس چیز کا تھا؟

خوف ناک لوگوں کے خوف ناک مظالم۔

یہ سب کچھ جاننے کے لیے "سُرخ تیر" کا تیسرا حصّہ

سُرخ تیر کے قیدی

ضرور پڑھیے۔

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر